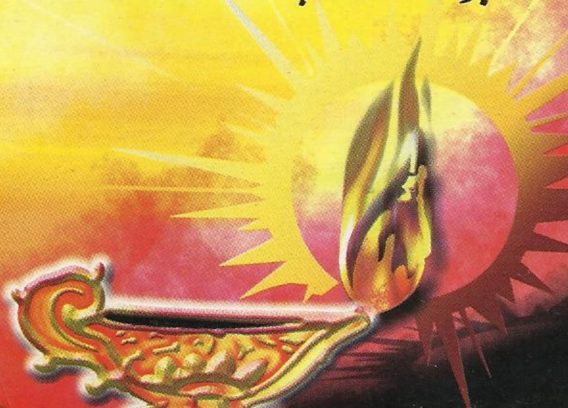
چراغ تلے اندھیرا

ہندو منصف کا مسلمانہ فیصلہ

مقدمہ نمبر ۵۶۵ سنہ ۱۹۳۶ء جونپور



مصنف

پنڈت ٹھاکر پرشاد

پیشکش

عبدالکریم مشتاق

45

ہندو منصف کا مسلمانہ فیصلہ

(مقدمہ 565ء سنہ 1936ء جونپور)

چراغ تلے اندھیرا

منصف

پنڈت ٹھاکر پرشاد (ایم اے، ایل ایل بی)

پیشکش

عبدالکریم مشتاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ الطیبین والطاہرین = امابعد ؕ

پنڈت ٹھاکر پرشاد منصف جونپور (بھارت) نے ۲۰ / جولائی ۱۹۳۸ء کو مقدمہ 565 سال ۱۹۳۶ء کا فیصلہ دیا۔ یہ کتاب اسی فیصلہ سے ماخوذ ہے اور ارباب انصاف کو دعوت غور و فکر دیتی ہے۔ منصف مزاج، غیر جانبدار اور انصاف پسند قارئین اس کے مطالعہ سے اپنی تحقیقات میں غیر معمولی اضافہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم نے صحافتی دیانتداری اور ادبی تقاضوں کے پیش نظر اس کے اصلی مفاہیم و مطالب میں کمی و بیشی کرنے سے اجتناب کیا ہے لہذا اگر کسی مقام پر کسی قاری کو ناگواری محسوس ہو تو ایک غیر مسلم کی عبارت خیال کرتے ہوئے درگذر سے کام لے۔ بے شک رواداری مسلمان کا شیوہ ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ حالات حا... یہ کاوش مفید ثابت ہوگی۔

۱۹۶۱...

...ء

مدعیان:- (۱) سید علی محمد (۲) سید شبیر حسین (۳) شاہ علی محمد (۴) شاہ محمد تقی (۵) جواد حسین خاں (۶) شیخ عبدالمجید

بنام

مدعا علیہان:- (۱) ایس شیخ علی حسین (۲) خالفنا صاحب عبدالحمید (۳) ایم عبدالمتین (۴) ایم قیام الدین (۵) شیخ عبدالرب (۶) سید حامد حسین (۷) شیخ شمس الدین احمد (۸) شیخ عبدالحمید (۹) بقر عید (۱۰) حیدر حسین (۱۱) محمد صدیق خاں (۱۲) ایم عبدالوحید خاں (۱۳) حکیم الیس (۱۴) رحیم داد خاں (۱۵) شیخ ولی محمد

فیصلہ

یہ ایک رسوا کن تنازعہ ہے کہ جس پر غور و خوض کر کے ہمیں ان اسباب و حالات کو تلاش کرنا ہے جو محمدن آبادی کے دو بڑے گروہوں شیعہ و سُنی کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی اور نقص امن کا باعث بنے ہیں۔ جن کے نتیجے میں شہری امن و امان کو شدید دھچکا لگا ہے۔

"**مدعیان**" اس مقدمہ میں مسلمانوں کے شیعہ فرقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور "**مدعا علیہان**" سُنی فرقہ اسلام کے ترجمان ہیں۔ مدعی فریق کا دعویٰ ہے کہ وہ جونپور کے باشندے ہیں اور شیعہ مذہب کے پیروکار، خصوصاً اہلبیت پیغمبرؐ کے انتہائی عقیدت مند اور

ان کی عبادت وذکر بھی کرنے والے ہیں یعنی رسولؐ اسلام کے گھر والوں (اہلبیتؑ) کو مانتے ہیں اور خاص طور پر حضرت علیؑ اور اُن کے دونوں فرزندوں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے نظریہ کی اساس یہ ہے کہ حضرت حسینؑ کا خلافت اسلامیہ کے لئے بیجا دعویٰ بنی اُمیہ نے یزید کی خاطر ظلم و ناانصافی کرکے مسترد کیا اور کربلا کی لڑائی میں غیر منصفانہ طریقہ سے انتہائی بربریت کے ساتھ ان کو قتل کرکے ایسی بدترین مثال قائم کی جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں دستیاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ مدعیان حسینؑ کی اس مظلومانہ شہادت کی یاد دُنیا کے ہر گوشے میں جہاں کہیں انکی تھوڑی یا زیادہ آبادی موجود ہے صدیوں سے مناتے آرہے ہیں یہ لوگ عرصہ دراز سے جونپور میں بھی اسی طریقہ پر عامل چلے آئے ہیں۔ اس معاملہ خاص کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر سال (قمری) کے صفر کی ۱۹ تاریخ کو یہ لوگ "امام باڑہ اسلام" سے اپنا ایک جلوس برآمد کرتے ہیں جو کہ شاہراہ جونپور سے ہوتا ہوا ایک عام گزرگاہ جسے "قاضی کی گلی" کہا جاتا ہے سے گزرتا ہوا "امام باڑہ صدر" پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ شیعہ لوگ اپنی قدیم (مذہبی) رسم کے مطابق تعزیہ کا جلوس لئے روتے پیٹتے نوحہ خوانی و ماتم کرتے، طبل و تاشہ بجاتے ہوئے مقررہ راستہ طے کرتے ہیں اور امام حسینؑ کے اتلاف زندگی کے عظیم انسانی نقصان کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن کے قاتلوں (کے ظلم) اور امام کی شہادت کا بیان کرتے ہوئے آپ کے قاتلین کی مذمت کرتے ہیں اور خاص طور پر عمر ابن سعد، حرملہ، سنان، یزید، شیث، شمر اور خولی

پر لعن طعن کرتے ہیں۔

جب کہ عمومی طور پر سُنّی شیعوں کے اس مذہبی شعار سے اختلاف کرتے ہیں اور اُن کے اس قانونی حق کی بجاآوری سے مخالفت رکھتے ہیں لہٰذا مدعیان کی درخواست ہے کہ اُن کو اس قانونی حق کی بجاآوری میں قانونی تحفظ مہیا کیا جائے کہ وہ اپنا یہ شہری حق حسب دستور اپنا مذہبی جلوس بمطابق رسم و رواج طبل و تاشہ کی آواز، نوحہ خوانی، ماتم برائے امام حسینؑ اور امام کے مذکور بالا سات قاتلوں پر لعنت کرنے کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ اور اپنے جلوس کو جون پور کی بڑی سڑک اور قاضی کی گلی کے راستوں پر سے آزادانہ طریقہ پر نکال سکیں اور اس کے لئے (حفاظتی) انتظام کیا جائے۔

شیعہ حقوق سے انکار کی بُنیادیں

اس کے برعکس مدعا علیہان یعنی سُنّی لوگ مدعیان یعنی شیعوں کے ان قانونی حقوق کا جوکہ انھوں نے اپنے مقدمہ میں بیان کئے ہیں مندرجہ ذیل بنیادوں پر انکار کرتے ہیں۔

۱۔ شیعہ اپنے جلوس میں خفیہ طور پر اُن کے پہلے تین ۳ خلیفوں یعنی خلفائے ثلاثہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں جوکہ غیر قانونی بات ہے اس لئے مقامی انتظامیہ کو چاہیئے کہ ان کے بیان کردہ حقوق کو منجمد کرے۔ سُنّی کہتے ہیں کہ شیعوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ وہ اپنے جلوسوں میں امام حسین کے قاتلوں پر لعنت کرتے ہیں جبکہ

حقیقت یہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے خلفاء ثلاثہ پر لعنت کرتے ہیں۔

۲۔ جہاں تک ان سات اشخاص پر لعنت کرنے کا سوال ہے ہمارے نزدیک وہ بھی اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ان ساتوں میں عمر بن سعد ہے جو پیغمبرؐ کا رشتہ دار ہے اور شمر حضرت علیؑ کا سالا تھا جبکہ باقی تمام کے تمام بہر طور مسلمان ہیں لہٰذا کسی کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا ایک گناہ ہے جس کی قانونی طور پر اجازت نہیں رہنا چاہیئے۔

کسی پر لعنت کرنا جسے کہ اصطلاح میں تبرّا کہا جاتا ہے ٹھیک بات نہیں۔ مدعیان یہ عمل اپنے جلوسوں میں طبل و تاشہ کے شور و غل میں کرتے ہیں تاکہ اُن کی آواز اس غل میں دب جائے لہٰذا یہ تبرا دوسروں کو سنائی نہیں دیتا۔ شیعوں کی ایسی تبرّہ بازی غیر قانونی ہے پس مقامی انتظامیہ کو چاہیئے کہ وہ شیعوں کے جلوسوں پر پابندی عائد کر دے۔

۳۔ مدعا علیہان نے مدعیان کے مذکورہ حقوق کے مطالبہ کے مقابلے میں کوئی آئینی مداخلت کا جواز پیش نہیں کیا۔ نہ ہی انھوں نے اس سلسلہ میں مقامی انتظامیہ کی طرف رجوع کیا ہے کہ شیعوں کے خلاف اس بارے میں کوئی قانونی چارہ جوئی کی جائے لہٰذا اُن کا یہ موقف غیر موثر قرار پاتا ہے۔

۴۔ فریق ثانی نے مزید کہا کہ جون پور میں مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو شیعوں کے بیان کردہ سات قاتلانِ حسینؑ کو اپنا پیشوا مانتا ہے لہٰذا ان پر لعنت

کرنے سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں جس کے ردعمل میں خلل امن داماں واقع ہونے کے خدشات موجود ہیں۔

۵۔ علاوہ ازیں تعزیہ داری اور ماتم داری از خود مذہب شیعہ کے برخلاف ہے لہٰذا مدعیان کو یہ سہولت بہم پہنچانا اور اس قسم کی اجازت مرحمت کرنا مناسب نہ ہوگا۔

۶۔ دولت ہند کے سکریٹری اس مقدمہ کے اہم فریق ہیں۔ ان کی عدم شرکت کے سبب قانونی اعتبار سے یہ مقدمہ ناقص قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ایک اہم فریق اس میں شرکت نہیں کر رہا ہے۔

۷۔ آخری موقف یہ ہے کہ جسے فریق صفائی نے اختیار کیا ہے کہ شیعوں کو جلوس نکالنے کی اجازت دینا یا نہ دینا عدالت عالیہ کی صوابدید پر ہے۔ اب چونکہ شیعوں کے جلوس سے شہری امن کو خطرہ ہے لہٰذا اس کے پیش نظر استدعا ہے کہ معزز عدالت شیعوں کی یہ درخواست نامنظور کر دے۔

تلخیص

اس تنازعہ میں مدعا علیہان کی اختیار کردہ شقوں کی تلخیص اس طرح ہوتی ہے کہ۔

(۱) کیا مدعیوں کو اپنے مذہبی جلوس کو برآمد کرنے کا حق حاصل ہے؟

(۲) کیا فریق مخالف کو یہ قانونی حق پہنچتا ہے کہ وہ مدعیداروں کے جلوس نکالنے کے مندرجہ بالا طریق کار پہ اعتراض کر سکے؟

(۳) کیا حکومت ہند کے سکریٹری اس مقدمہ میں فریق واقعی ہیں اگر ہیں تو ان کی شرکت کس قانونی پایۂ اہمیت کی حامل ہے؟

(۴) کیا دعویٰ کرنے والوں کے پاس کوئی معقول آئینی لائحۂ عمل ہے؟

عمر عیان کو کس حد تک سہولت دی جا سکتی ہے اور ان کو کس رعایت کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

دریافتی تحقیقات

سوال ۱ اور ۲۔ (مسلمانوں کی تاریخ پر طائرانہ نگاہ)

فریقین کے نظریات و خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس معاملہ کو سلجھانے اور اس کی تہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ مختصراً مسلمانوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے جس میں ان دونوں فرقوں کی باہمی نزاع و مناقشت کی اصلیت مندرج ہے۔ یہ دونوں فرقے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر راسخ ایمان رکھنے کے دعویدار ہیں اور ان کو اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہیں اور ان کی تبلیغ و نقش قدم پر متفق ہیں۔ دونوں قرآن کے الہامی ہونے پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ پیغمبر کی وفات سے پہلے ان کے معتمد پیروکاروں میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا مگر ان کی رحلت کے بعد جو مشکل مسئلہ اسلامی دنیا کو پیش آیا وہ آنحضرتؐ کے بعد ان کے جانشین کی تقرری کا تھا جسے خلیفہ، امام، روحانی پیشوا یا اسلامی دنیا کی حکومت کا حاکم کہا جاتا تھا۔ وفاتِ رسولؐ کے وقت آپ کی چہیتی بیوی حضرت عائشہ، محبوب ترین چچیرے بھائی اور داماد

حضرت علیؑ جن کی شادی حضورؐ کی اکلوتی صاحبزادی فاطمہؑ اور حسنؑ اور حسینؑ جو کہ پیغمبرؐ کے دو نواسے تھے، علیؑ کے بیٹے تھے اور بنت رسولؐ فاطمہؑ کے فرزند تھے۔ ان کے علاوہ حضورؐ کے اہل بیتؑ میں کوئی اور فرزند نہ تھا۔ جیسا کہ مسٹر جسٹس آرنلڈ نے اپنے ایک مشہور فیصلہ میں کہا ہے جو انھوں نے بمبئی ہائیکورٹ میں ایک ممتاز خوجہ کے کیس میں صادر کیا ہے۔ موصوف جسٹس اس طرح لکھتے ہیں کہ:۔ "اہل اسلام میں عام توقع یہی تھی کہ علیؑ (آنحضرتؐ کے) پہلے جانشین ہیں۔ کیونکہ وہ نبیؐ کے محبوب صحابی، ان کی چہیتی و اکلوتی وارث بیٹی فاطمہؑ کے شوہر تھے۔ مگر ایسا نہ ہوا پیغمبرؐ کی جوان محبوبہ بیوی عائشہ جو کہ فاطمہؑ اور علیؑ کے خلاف پرخاش رکھتی تھیں اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ ایک انتخاب کے تحت اپنے باپ ابوبکر کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔ علیؑ جو کہ اس (امر خلافت) کے حقیقی حقدار تھے، رسول اللہؐ کے محبوب ترین تھے اور (فضائل میں) اپنا کوئی ثانی نہ رکھتے تھے۔ وقت کے شجاع ترین ہیرو تھے نیز بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ دانا، اعلیٰ قاضی، عمدہ ناظم، زاہد، متقی، پرہیزگار اور تاریخ کے بلند کردار شخص تھے اور نبی کی اکلوتی بیٹی کے شوہر نامدار اپنے دو فرزندوں یعنی حسنؑ و حسینؑ کے پدر بزرگوار تھے۔ وہ فرزند کہ جو رسولؐ خدا کو بہت زیادہ پیارے تھے اور آنحضرتؐ نے اپنے ان دونوں نواسوں کو جنتؐ کے نوجوانوں کا سردار ہونے کا خطاب عطا فرمایا تھا۔"

علیؑ رسولؐ خدا کا وہ سایہ تھے جو ان سے کبھی جدا نہ ہوا اس بات

فاضل مصنف نے daughter بیٹی وارثہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علیؑ پیغمبرؐ کے ان اصحاب میں سے تھے جو ہر حالت میں حضورؐ کے ساتھ سینہ سپر رہے اور ساری زندگی وہی کیا جو پیغمبرؐ نے کیا یا آپ نے چاہا۔ جہاں تک میں نے مسلمانوں یا غیر مسلموں کی تحریر کردہ تاریخوں سے اخذ کیا ہے میں دیکھتا ہوں کہ علیؑ رسول خداؐ کا وہ سایہ تھے جو ان سے کبھی جدا نہ ہوا۔ اُن کا برتاؤ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ بوسویل کا جانسن کے ساتھ تھا۔ علیؑ یقیناً اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو پیغمبرؐ کا قوتِ بازو قرار دیا جائے وہ اقتدارِ پیغمبرؐ کے حقیقی معمار ہیں (جو کہ دانشوروں میں دانا ترین ا میدانِ جہاد کے اشجع ترین مجاہد) ان ہی کی تلوار سے شاندار فتوحات حاصل ہوئیں۔ خندق، احد، بدر، اور خیبر کے معرکے سر ہوئے۔ علیؑ کی بدولت ہی محمد کا مشن پھلا پھولا اور آناً فاناً دنیا میں اس تیزی سے پھیل گیا کہ انسانی تاریخ میں کسی تحریک کو ایسی سرعت و وسعت نصیب نہیں ہوئی۔ استحکام اسلام میں علیؑ نے محمد کے ہاتھوں کو مضبوط تر کیا۔ پیغام اسلام کو دوامی حیات عطا کی۔" الغرض یہ سب خدمات علیؑ کے اس حق کی تائید کرتی ہیں کہ اسلام کی صحیح قیادت کے لئے علیؑ سے بڑھ کر کوئی حقدار نہ تھا اس منصب کا اہل کوئی دوسرا ہرگز نہ تھا۔ رسول اللہؐ سے قرابت داری اور ذاتی خصوصیات کے پیشِ نظر مخلص ترین دوست اور فرماں بردار پیرو کار رسولؐ ہونے کے باعث شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر صحیح انتخاب ہوتا تو علیؑ یقیناً یہ انتخاب جیت جاتے علیؑ کا حقِ خلافت اس حقیقت سے بھی تقویت پاتا ہے کہ پیغمبرؐ نے بھی حیات میں گاہے بگاہے علانیہ طور پر لوگوں میں علیؑ کی ولی عہدی کا

آزادانہ و کھلا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ میں اس سلسلہ میں میجر پرائس کی تحریر کردہ تاریخی کتاب "ہسٹری آف محمڈن ایمپائر" کے صفحہ ۱۱ سے اقتباس کا حوالہ پیش کرتا ہوں۔

میجر پرائس کا بیان غدیر

"مکہ سے واپسی کے موقع پر علیؑ کے ساتھ رسالت مآبؐ کا اعزاز بخش رویہ اس بات کی تشفی کن نشاندہی کرتا ہے کہ آپؐ نے ان کو اپنا ولی عہد مقرر فرمایا اس طرز عمل سے عملی طور پر نہ سہی لیکن جزوی اعتبار سے ان مراعات اور اعزازات کے بل بوتے پر یہ ماننا پڑے گا کہ آنحضرتؐ اقتدار حکومت علیؑ کو سونپ دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ دوران سفر خم غدیر کے قریب درختوں کے جھنڈ میں جلسہ عام کا تعجیلی اہتمام فرمانا، اونٹوں کے کجاووں کا منبر بنانا، آگے نکل گئے مسلمانوں کو واپس بلوانا اور پیچھے رہ گئے لوگوں کا انتظار کرنا، پھر علیؑ کا ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر انبوہ کثیر سے خطاب کرنا اور اپنے خطبہ کو یہاں تک پہنچانا کہ "جس کا میں مولا اس کا علی مولا"، پھر علیؑ کے ہاتھوں کو بلند کرنا اس حد تک کہ ان کے قدم نبیؐ کے گھٹنوں تک پہنچے کہ سارا مجمع بچشم خود دیکھے کہ اللہ کا رسولؐ کس کو بلند کر رہا ہے۔ اور اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے یہ فرمانا کہ جس طرح تم سب کی جانوں کا میں والی ہوں اسی طرح میرے بعد یہ علی بھی والی ہے۔ پھر قسم کھا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد کرنا کہ اے خداوندا تو دوست رکھ اس کو جو علیؑ کو دوست رکھے دشمن رکھ اس کو جو علیؑ کو دشمن رکھے اور اس کے بعد آنحضرتؐ کا

خیمے میں واپس تشریف لانا۔ علیؑ کی دستار بندی کرنا۔ جمع کثیر کی موجودگی میں حضورؐ کا مبارک باد دینا اور علیؑ کی اس تقرری و کامیابی پر لوگوں کا ہدیہ تہنیت پیش کرنا وغیرہ سب کچھ علیؑ کے حق کی گواہی دیتا ہے،، میجر پرائس جو کہ مسلمانوں کی قدیم تاریخ کے معتبر مؤرخ ہیں۔ بڑے وثوق سے علیؑ کا حقِ خلافت و امامت بیان کر چکے۔ لیکن (افسوس!) علیؑ کے ساتھ تو منی قسمت یہ ہوئی کہ وہ اپنی عادات و خصائل میں سادہ لوح، فضائل و شمائل میں پارسا اور اپنے حق کو (زبردستی) لینے میں کمزور واقع ہوئے وفات پیغمبرؐ پر وہ ان کی تدفین میں مشغول رہے۔ اس اثناء میں دوسری طرف رسولؐ کی چہیتی بیوہ عائشہ نے اپنے پورے اثر و رسوخ کو بروئے عمل لاتے ہوئے اپنے باپ کے لئے کامیابی کی راہیں ہموار کرلیں اور ان کو منتخب کرلیا گیا۔ اس سلسلہ میں علیؑ کی دوسری بدقسمتی یہ ٹھہری جو کہ ان کے لئے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوئی کہ ان کے تعلقات عائشہ کے ساتھ ناخوشگوار تھے اور آخری ایام میں خاندان رسولؐ میں عائشہ نے قابل ذکر حیثیت اختیار کر لی تھی اور خاص طور پر ایام مرض میں ان بی بی صاحبہ نے فضا کو کافی حد تک اپنے قبضہ قدرت میں لے لیا تھا۔ یہ علیؑ بن ابی طالب جو کہ عائشہ کے پہلے سے مخالف تھے اور "قضیہ افک،، پر انھوں نے عائشہ کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا حالانکہ یہ مخالفت بھی علیؑ کی کسی ذاتی غرض کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس کا سبب بھی پیغمبرؐ اسلام کا بہتر مفاد تھا۔ مگر بی بی عائشہ نے ساری

زندگی یہ بغض اپنے سینے میں محفوظ رکھا اور جب کبھی بھی علیؑ کو نقصان پہنچانے کا موقعہ ہاتھ آیا بی بی نے اس موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور علیؑ کو نیچا دکھانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔

علیؑ کے حقوق کی پامالی اور اُمت کا باہمی نفاق!

بی بی عائشہ کے والد حضرت ابوبکر بھی بااثر آدمی تھے۔ لہٰذا علیؑ کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے وہ اپنے اثر و رسوخ سے خلافت کا تاج اپنے سر پر سجا لینے پر راضی ہو گئے۔ اس وقت کے وفا شعار مسلمانوں نے اس غیر منصفانہ اقدام کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ وفادار (مسلم) جماعت دل سے یقین رکھتی تھی کہ حضرت علیؑ ہی منصب خلافت کے اہل ہیں۔ ان لوگوں کا نظریہ ہے کہ خلافت علیؑ اور اولاد علیؑ کا پیدائشی حق ہے۔ یہ اہلیت ان ہی میں ہے کہ وہ دنیوی اسلامی خلافت، حکومت اور امامت کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں اور تینوں خلیفے حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان غاصبانہ قبضے کے ذریعہ برسراقتدار آئے اور وہ تمام کے تمام اس بات کے مجرم ہیں کہ انھوں نے حقیقی حقدار علیؑ کے اس موروثی حق پر ڈاکہ ڈالا۔ چنانچہ یہی وہ جماعت ہے جو اس نظریہ کے باعث "شیعہ" کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ شیعہ کے معنی حب دار یا پیروکار کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ شیعہ اپنے رسولؐ کے اہلبیت کے پیروکار ہیں۔ نبی کے گھرانے کو مانتے ہیں جو کہ علیؑ اُن کے صاحبزادوں حسنؑ و حسینؑ اور فاطمہؑ جو کہ پیغمبرؐ کی

دفتر ہیں کے معتقد ہیں۔ محمدیوں (مسلمانوں) کا ایک اور گروہ جو شیعوں کے اس دعویٰ کا مخالف ہے اور علیؑ کو اس بنیاد پر خلیفہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ خلیفے کے چناؤ کے لئے انتخاب کے اصول کا قائل ہے اس گروہ کو اہل سنت یا سنی کہا جاتا ہے۔

بنی امیہ کی روش

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کی موت کے بعد علیؑ کا دعویٰ از خود تسلیم کر لیا گیا اور خلافت یا حکومت کی باگ ڈور ان کے حوالہ کر دی گئی۔ لیکن مخالف قوتیں ان کے خلاف رہیں۔ ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں مصروف کار رہیں۔ ان کے نمایاں مخالف اور خطرناک دشمن بنی امیہ تھے۔ جو کہ قریشی عرب قبائل ہی میں سے ایک قبیلہ ہے جن کا سردار ابوسفیان تھا۔ ابوسفیان محمدؐ کے سخت ترین جانی دشمنوں میں سے تھا اس کا مشن محمدؐ کے ساتھ ہر قدم پر لڑنا۔ اسلام کے برخلاف پروپیگنڈا کرنا اور مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ بکھیرنا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ محمدؐ کو مذہبی اور ریاستی دونوں طاقتیں نصیب ہو گئی ہیں تو وہ بے بس، لاچار اور مجبور ہو کر عالم بے چارگی میں حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ ابوسفیان اور اس کے اہل خاندان نے زبان سے تو کلمہ اسلام پڑھ لیا لیکن ان کے دلوں میں اپنی ناکامی و خجالت کے انتقام کی چنگاری سلگتی رہی۔ معاویہ اسی ابوسفیان کا بیٹا تھا۔ یہ علیؑ کے پیچھے پڑا رہا۔ علیؑ نے پر آشوب حالات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا اور اسکی شاطرانہ چالوں کو ناکام بناتے رہے۔ یہ معاویہ بڑا مضبوط آدمی تھا۔

لہٰذا اُسے سلطنت اسلامیہ کو دو ٹکڑے کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ ایک حصہ علیؑ کے زیر حکومت ہوا اور دوسرا معاویہ کے زیر تسلط آیا مگر اس پر بھی معاویہ نے علیؑ کو چین کی سانس نہ لینے دی۔ عائشہ کی طرف سے معاویہ کو حمایت و کمک مسلسل ملتی رہی اور وہ متواتر علیؑ کے لئے پریشانیوں کا موجب بنے رہے۔ حتیٰ کہ مسجد کوفہ میں جو کہ دریائے فرات کے کنارے پر ایک قصبہ ہے ایک مسلمان (خارجی) نے علیؑ کا کام تمام کر دیا۔ شہادت علی کے بعد ان کے بڑے بیٹے حسنؑ بن علیؑ تخت نشین ہوئے جسٹس آرنلڈ کے مطابق، حسنؑ حضرت علیؑ کے بڑے فرزند اپنے مقدس والد کی مظلومانہ شہادت کے بعد بادشاہت کے پیدائشی حق کو کثیر رقم کے عوض میں معاویہ کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس پیسے سے وہ اپنی زندگی کے مصارف خیر و خیرات، مذہبی فلاح و بہبود کے کاموں کے اخراجات مدینے میں رہ کر کیا کرتے تھے۔ ۶۶۹ء میں پیغمبر اسلام کا یہ بے گناہ نواسہ اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کے ذریعہ زہر دیئے جانے کے سبب انتقال کر گیا۔ اس بیوی کو یزید پلید نے رشوت دی تھی۔ اور یہ معاویہ کا یہ بیٹا تخت دمشق پر بنی اُمیہ کا دوسرا خلیفہ ہونے والا تھا۔ اب نبی (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کا براہ راست خونی رشتہ دار اور اسلام کا بہی خواہ صرف حسینؑ تھا۔ جو علیؑ و فاطمہؑ کا چھوٹا بیٹا ایک بہادر، نیک سیرت انسان کہ جس میں اس کے باپ کی روح کام کرتی تھی تنہا باقی رہ گیا تھا۔ معاویہ نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے

یزید کو جانشین مقرر کر دیا۔ مرتے وقت معاویہ نے بدترین عہد
شکنی کا مظاہرہ کیا اور امام حسنؑ سے اپنے صلح کے عہد نامہ کے اصل
عہد سے پھر گیا کہ جس کے تحت اسے اپنے انتقال کے بعد زمام اقتدار
امام حسنؑ یا امام حسینؑ کے سپرد کرنا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد معاویہ چل بسا
اور اس کی جگہ اپنے باپ کی جاگیر سمجھتے ہوئے یزید بن معاویہ تخت نشین
ہوا۔ معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کر کے تمام سابقہ اسلامی
طریقہ کاروں کی مخالفت کی تھی لہذا قانونی لحاظ سے یزید کی جانشینی
قطعی طور پر ناروا تھی۔ یہ یزید کہ جس کا تذکرہ کیا گیا ابوسفیان کا پوتا
تھا عہد علویہؑ میں دولت اسلامیہ کے دولخت ہو جانے کے بعد
اور ایک حصہ معاویہ کے مستفید ہونے کے پیچھے بنو امیہ نے مسلمانوں
کی تاریخ کا ایک اور اضافی باب کھولا۔ اب سلطنت کا مالک معاویہ
جو اسلام کے بدترین دشمن ابوسفیان کا بیٹا تھا قرار پایا۔ چنانچہ بنی امیہ
نے شام جیسے دارالحکومت دمشق میں ملوکیت کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے
اسلامی تبلیغ کو نئی بدرنگیوں سے پیش کرنا شروع کیا۔ اور دین
کی شکل بگاڑنے میں لگ گئے۔ اس وقت مسخ شدہ مذہب اسلام
بنی امیہ کی زیر نگین قلمرو میں رواج پانے لگا۔ مگر حقیقی اسلام
کا نور ابھی مدینہ میں خاندان رسولؐ کے دم سے جگمگا رہا تھا۔ پیغمبرؐ
کے دین پر اس سے کڑا آزمائش کا وقت کبھی نہ آیا تھا۔ اگر بدقسمتی
سے معاویہ اور اس کا گھرانہ اہلبیت نبویؐ کی روحانی قوتوں کو
مٹانے میں کامیاب ہو جاتے تو آج اسلام کی شکل کچھ اور ہی ہوتی۔
شاید اسلام ایک بھولی بسری داستان ہو چکا ہوتا۔ ارکان بنی امیہ

جنھوں نے اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں، رسول ؐ اسلام سے علانیہ دشمنی رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کے کردار روز روشن کی طرح واضح ہیں جیسا کہ گبن اپنی تاریخ "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" کے صفحہ ۱۹۰ پر لکھتے ہیں کہ "اہل شام کے علاوہ بنی امیہ کو کبھی اور کسی جگہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی حیات محمدؐ میں ان کے باغیانہ کارنامے انکا بے دلی سے اسلام قبول کر لینا ناجائز طریقوں سے تخت حکومت حاصل کرنا اپنے اقتدار کی عمارت کو عرب کے سب سے مقدس افراد کے خون کے گارے سے مضبوط کرنا ایسے سیاہ کارنامے ہیں کہ جو اُن کی حقیقی و اصلی تصویر پیش کر دیتے ہیں"

اس کے علاوہ متعدد ممتاز انگریز مصنفین مثلاً میجر پرائس مسٹر گبن اور گل مین نے معاویہ اور یزید کی پر زور طریقہ سے مذمت کی ہے جیسے میجر پرائس کی تاریخ "ہسٹری آف دی محمڈن ایمپائر" صفحہ ۳۲۹، گبن کی "ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" صفحہ ۱۹۰ اور سیرسن کی شارٹ ہسٹری مرتبہ امیر علی صفحہ ۸۱ کے مطابق یہ ہے کہ معاویہ و یزید کی تمام حکمت عملی اور کارگزاری سب کی سب غیر اسلامی، غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔ جیسا کہ معاویہ نے مرتے وقت اس کو تسلیم کیا ہے شاید اس لئے کہ یہ اعتراف قیامت کے دن اُسے کوئی فائدہ بخش دے۔ میں یہ نکتہ میجر پرائس کی زبان سے نقل کرتا ہوں۔

معاویہ کی وقت آخر یزید کو وصیت

"بوقت موت

معاویہ سے کہا گیا کہ وہ اپنے وزراء کے سامنے کوئی وصیت کرے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ مجھے تین چیزوں کا بہت افسوس ہے پہلی یہ کہ میں حرص و ہوا میں گمراہ ہوا۔ اور میں نے بنی آدم کی مقدس آل کے حقوق کا ناحق خون کیا۔ دوم یہ کہ میں نے امام حسنؑ کی بیوی سے ان کو زہر دلوایا۔ سوم یہ کہ میں نے یزید کو اپنے بعد اپنا وارث مقرر کیا۔" (یہ ائس کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۳۸۹) معاویہ نے مرنے سے کچھ دیر پہلے اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ بعض چیزوں سے خبردار رہے۔ میجر پرائس لکھتے ہیں کہ "اپنی بیماری کے دوران اس نے اپنے جانشین یزید کو طلب کیا اور اسے کہا کہ میں نے حتی المقدور تمہاری حکومت کو ہر شخص سے محفوظ کر دیا ہے مگر پھر بھی مجھے خدشہ ہے کہ میرے مرجانے کے بعد چار آدمی تیرے خلاف سر اٹھائیں گے وہ حسینؑ بن علی۔ عبداللہ بن عمر۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور عبداللہ بن زبیر ہیں۔ خوب جان رکھو! کہ حسینؑ رسولِ خداؐ کے نواسے ہیں اور وہ اس مملکت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ اگر تم ان پر غلبہ پالو تو ان سے فیاضانہ سلوک کرنا" یہ معاویہ کا خود اپنا اعتراف ہے جس سے علیؑ و اولادِ علیؑ کے استحقاقِ خلافت کا ٹھوس ثبوت حاصل ہوتا ہے یزید اپنے باپ سے بھی بدتر تھا۔ یہ وہی بدبخت ہے جو واقعہ کربلا کے المناک سانحہ کا ذمہ دار ہے۔ وہ واقعہ کہ انسانیت کی تاریخ میں ظلم و ستم کی داستانوں میں سرفہرست آتا ہے۔

یزید کا کردار

اپنے باپ کے مرجانے کے بعد جب یزید بادشاہ بنا تو اسے احساس ہوا کہ اسے مسلم عوام الناس

کی دلی حمایت حاصل نہیں ہے اور اس کی جانشینی مسلمانوں کے تمام گزشتہ طریقوں سے مختلف ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سچے مسلمانوں کے دل امام حسینؑ کی طرف جھکے ہوئے ہیں جو کہ سبطِ پیغمبرؐ ہے اور اُن کی زندگی میں اس کو کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ یا تو حسینؑ اس کی اطاعت کو قبول کر لیں یا پھر ان کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے پہلے ان سے بیعت طلب کی جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا گیا۔ یزید صرف مسلمان دنیا کی ایک مملکت ارضی کا فرماں روا ہی نہ تھا بلکہ اس مسلک اور مذہب کا سرچارک بھی تھا جس کی بنیاد جد یزید اسلام کے نام سے اس کے باپ نے دمشق میں رکھی تھی۔ جبکہ امام حسینؑ یہ سمجھتے تھے کہ اُصولی طور پر حکومت ان کا حق ہے جسے طاقت کے بل پر ان سے غصب کر لیا گیا ہے اور یزید کی خلافت اسلام کے لئے بہت بڑا المیہ ہے کیونکہ جو اسلام ان کے نانا رسول اللہ لائے تھے یزید اس میں دست اندازیاں کر رہا تھا۔ اور اندر ہی اندر دین محمدیؐ کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مشغول تھا۔ حسینؑ اپنی آنکھوں سے اسلام کا حلیہ بگڑتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ یزید کی بیعت کر لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ حسینؑ نے یزید کی ملوکیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ لہٰذا آپ نے یزید کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کوفہ علویہ میں شہر کوفہ عراق کے قصبات میں خاصی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ یہ شہر دریائے فرات کے کنارے پر واقع ہے اور

حضرت امیرؑ کے عہد میں دارالسلطنت بنایا گیا تھا۔ لہٰذا اہل کوفہ قدرتی طور پر علیؑ کے جاں نثار بن چکے تھے۔ وہ یزید کی غیر آئینی حکومت کے برخلاف تھے اور اس کی جگہ امام حسینؑ کو برسر اقتدار لانے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انھوں نے لاتعداد دعوت نامے حسینؑ کی طرف روانہ کئے۔ اور اُن کو یقین دلایا گیا کہ وہ یزید کے خلاف امام کی پوری حمایت و نصرت کریں گے۔ امام حسینؑ کے کئی احباب نے اہل کوفہ کی وعدہ خلافیوں کے بارے میں امام کو خبردار کیا۔ مگر امامؑ نے ان نصیحتوں پر کان نہ دھرا۔ آپؑ کا ذہن ایک مخصوص سوچ میں ڈوبا رہا انھوں نے اپنے دوستوں کے نیک جذبات کی قدر دانی کی۔ آپ کو یقینی طور پر آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا علم تھا۔ مگر ان سب خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے اپنے نانا کے دین کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ نہتے یک و تنہا مار دیئے جائیں گے۔ لیکن ان کا ایمان تھا کہ ان کی شہادت سے بہا ہوا خون قصر اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کر دے گا۔ ان کی ذات دین کے بار آور درخت کے لئے بیج ثابت ہو گی۔ چنانچہ واقعہ کربلا رونما ہوا۔

سانحہ کربلا!

اور یہی روح سوز سانحہ تنازعہ زیر کاوت کا اصلی سبب ہے چنانچہ میں اس مقام پر ایڈورڈ گبن کے الفاظ جو کہ انھوں نے اپنی تاریخ "دی

ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر ،، کے صفحہ ۶ پر یہ لکھتے ہیں
کا حوالہ دیتا ہوں کہ شرافت حسینیہ اور امام کی اعلیٰ کارکردگی
نواسہ رسولؐ کا بلند کردار حسینؑ کو انسانیت کی معراج پر
لے گئیں۔ وہ بڑی آسانی سے یزید کی حمایت کر کے اپنا سب کچھ
بچا سکتے تھے مگر محض حفاظت حق کی خاطر وہ حکومت دمشق
کے باغی قرار پائے۔ آپؑ کو ایسے رسوا کن ناموں سے متہم
کیا گیا جو کہ ان کی عالی شان کے سراسر منافی تھے۔ خفیہ طریقے
سے ایک فہرست کوفہ سے لے کر مدینہ تک ایک لاکھ چالیس ہزار
مسلمانوں کی آبادی میں مشتہر کی گئی جس میں یہ تشہیر کیا گیا کہ
حکومت وقت کے خلاف خروج کرنے والے ایک باغی کا فرات
کے کنارے قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ حسینؑ جو کہ اپنے دانا دوستوں
کے مشورے کے برخلاف صرف چند احباب اور اپنے اہل خاندان
کی معیت میں عرب کی صحراؤں کا سفر کرتے ہوئے بال بچوں سمیت
عراق کی عربی زمین پر اتر آئے تھے وہاں کے گورنر عبیداللہ
کے سینے پر سانپ بنکر لوٹ رہے تھے۔ اس نے پانچ ہزار
کے ایک لشکر کو وادی نینوا میں حسینؑ کو گھیر لینے کے لئے روانہ
کیا جب اس لشکر نے حسینؑ اور ان کے اہل بیت کو گھیر
لیا تو آپ نے سردار لشکر کے سامنے اپنی تین تجویزیں پیش
فرمائیں کہ یا تو انھیں مدینہ واپس چلے جانے دیا جائے۔ یا پھر
تو ترکستان کی سرحد عبور کرنے دیا جائے۔ یا پھر بحفاظت
یزید کے پاس بھیج دیا جائے۔ پس یزیدی لشکر کے سردار نے

ان کی کوئی بات قبول نہ کی۔ اور اس بات پر اڑا رہا کہ یا تو امام
بیعت قبول کر لیں ورنہ جنگ کے لئے تیار رہوں۔ آپؑ نے
اُن لوگوں سے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارا یہ کثرت کو
دیکھ کر تمہارے امیر کی اطاعت قبول کر لوں گا۔ نہیں ایسا
ہرگز نہ ہوگا۔ چنانچہ امامؑ نے خود کو مقدر کے حوالہ کیا۔ حسینؑ
کے اہل خاندان اس خطرناک کشیدہ صورت سے متفکر ہوئے
انھوں نے اپنی ہمشیرہ کو مایوس دیکھکر کہا کہ ہمارا ایمان
خدائے واحد پر ہے۔ ہر چیز اسی کی ہے اور اسی کی طرف لوٹ
کر جانے والی ہے۔ میرے بھائی حسنؑ۔ باپ علیؑ، ماں فاطمہؑ
مجھ سے بہتر تھے۔ اور ہر مسلمان کو اپنے رسولؐ کے اسوہ کی مثال
ہمیشہ سامنے رکھنی چاہیئے۔ امامؑ نے اپنے تمام ساتھیوں کو
خبر دی کہ ان کو شہید کر دیا جائے گا۔ لہٰذا میرا کسی سے کوئی
شکوہ نہ ہوگا میں سب کو بخوشی اس بات کی اجازت دیتا
ہوں کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے جہاں چاہے چلا جائے۔
اصحاب حسینؑ نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہم کسی قیمت پر آپ کا
ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے وعدے کو سچ
کر دکھایا اور روز عاشورہ اپنی جانیں مولا پر فدا کر دیں قیامت خیز
دن کی صبح کو حسین مظلوم ایک ہاتھ میں قرآن لئے دشمن کے
مقابلہ میں نکلے یہ فدائی جماعت صرف بتیس ۳۲ گھوڑ سواروں
اور چالیس ۴۰ پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن ان کے حوصلے
سیسہ پلائی دیوار سے بھی مضبوط تھے۔ ان کی ہمت خیمہ صحرا کے

رشتوں سے زیادہ طاقتور اور ان کا عزم محفوظ قلعہ قوں سے زیادہ گہرا تھا۔ دشمن نے پہلے اپنے تیس ۳۰ نامور شہسواروں کو ایک ایک کے مقابل رن میں روانہ کیا لیکن جب بنو فاطمہؑ نے ان کو آناً فاناً ڈھیر کر دیا تو انھوں نے مشتعل ہو کر چاروں طرف سے نیزوں اور تیروں کی برسات شروع کر دی اور ہر طرف گھوڑے دوڑا دیئے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ مجاہدینِ حسینؑ نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور دشمن کی لاشوں سے میدان پٹ گیا۔ ابھی اتنا ہیں وقت نماز ہوا۔ اس وقت تک حسینؑ کے سب ساتھی جام شہادت نوش فرما چکے تھے۔ صبر و استقامت کے اس بلند پہاڑ نے اپنے ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے بوڑھے (مگر جوان عزم) حسینؑ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آپ کے ہاتھ خون سے رنگین تھے اور ان کے عزیزوں کی لاشیں خون میں لت پت زمین پر پڑی تھیں انھوں نے اپنے شہیدوں اور زندوں کی نماز جنازہ پڑھی دور خیمے سے دیکھتی ہوئی حسینؑ کی بہن نے بھائی کی بے بسی ملاحظہ کی۔ کہ آپ کی ریش مبارک خون میں تر تھی۔ ان کے لخت جگر میدان کربلا پر بکھرے ہوئے تھے۔ پس حیرت بھری نگاہ سے حسینؑ نے میدان کے چاروں طرف دیکھا اور سجدۂ شکر میں جا گرے۔ حسینؑ جھکے شمر اٹھا۔ وہ شمر کہ تاریخ وفا و اخلاص میں اس کو ظالم و سنگدل اور سفاک ترین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حسین کا جھکا ہوا سر جس پر امت نانائے حسین نیزوں اور تلواروں کے تینتیس ۳۳ سے زیادہ زخم لگا چکے تھے اب اٹھ نہ سکا۔ شمر اس کو کاٹنے میں

تو کامیاب ہو گیا لیکن مجبور ہوا کہ وہ سر کو نیزے پر بلند ہی رکھے سر اقدس کاٹ لینے کے بعد بڑے وحشیانہ طریقے سے اُسے دربار عبید اللہ بن زیاد میں بھیجا گیا اور لاش مبارک کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دیا گیا۔ ابن زیاد نے اس عظیم النشان کے مبارک سر بلند سے سخت غیر انسانی اور توہین آمیز برتاؤ کیا۔ اور دہن پاک پر اپنے بید کی چھڑی سے گستاخی کی۔ "ہائے افسوس! کیا غضب کرتے ہو" دربار میں سے ایک ضعیف مسلمان چیخ اٹھا۔ اور کہا کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اللہ کے رسولؐ کو ان ہونٹوں کے بوسے لیتے دیکھا ہے مگر اس بزرگ کی آہ از صدا بصحرا ثابت ہوئی!!"

سر حسینؑ اور اسیران کربلا سے سلوک!

سر امام حسینؑ کوفہ سے دربار یزید تک لے جایا گیا۔ یہ نقشہ میجر پرائس اپنی تاریخ کے صفحہ الہم پر بایں الفاظ لکھتے ہیں۔

"اسی اثناء میں کوفہ کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد نے کہ جس کے سامنے حسینؑ کا کٹا ہوا سر پڑا تھا اس چھڑی سے گستاخی کی اور اپنے رذیل ہونے کا مظاہرہ کیا اس کے بعد کوفہ کی ہر گلی و بازار میں جلوس کی شکل میں پھرایا گیا پھر اسے دمشق یزید کے دربار میں لے جایا گیا اور تمام راستہ میں یہ بات مشہور کی گئی کہ حکومت نے ایک باغی پر غلبہ پا کر اس کا سر کاٹ لیا ہے چنانچہ جب یزید کے دربار میں یہ سر پہنچا تو اس نے تکبر و نخوت

کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا اور لب ہائے مبارک سے گستاخی کی کہ دربار میں موجود ابو برزہ جیسے یزید کی یہ ہتک آمیز حرکت ناپسند وناگوار گزری بول اٹھا۔ باز آ اس بے ادبی سے کیونکہ میں نے کئی بار دیکھا کہ رسول خدا ان ہونٹوں کو چوما کرتے تھے یزید نے ابو برزہ کے سینے پر اپنی چھڑی مارتے ہوئے اسے پیچھے ہٹایا اور بڑے تکبر سے کہا وہ بھولی کہانی جو شریعت کے نام پر عرب کی تاریخ میں مشہور ہوئی تھی اس کا قصہ تمام ہو گیا۔ اس کے علاوہ یزید نے امام حسین کی شان میں واہی تباہی بکی۔ پھر وہ بڑے فخر کے ساتھ کھڑا ہوا یوں جیسے کوئی چمکدار ستارہ آسمان پر نمودار ہوتا ہے وہ اپنی اس ابتدائی فتح مندی پر از حد خوش تھا اور فلک اسلام کے اس نجم ہدایت کے غروب ہو جانے پر اپنے جی میں بڑی مسرت محسوس کر رہا تھا اس کے زعم میں انسانیت ساز ہستی کا وجود ختم ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی من مانی کرنے میں پوری طرح آزاد تھا۔ بالکل بے خطر تھا۔ نوع انسانی کا یہ چاند جسے کبھی گہن نہیں لگ سکتا بائیس ہزار کی فوج سے صرف بہتر[۷۲] نفوس کے ساتھ نبرد آزما ہوا جس میں اس کے اعلیٰ و شریف خاندان کے بچے اور مستورات شامل تھیں جنہوں نے رضاکارانہ طریقے سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا خوف و خطر مقابلہ کیا اور ثابت کر دیا کہ ہر سچا مسلمان اسی جذبہ و ایثار سے میدان حق میں مقابلہ کرتا ہے۔

امام حسین کا عزم صمیم، آپ کا خدا تعالیٰ پر یقین محکم اور آپ کے

راہ حق میں ڈٹے ہوئے مضبوط قدم آخری دم تک نہ ڈگمگائے۔

صبرِ حسینؑ مظلوم، مغربی مورخین کی زبانی

جب شمر کا خنجر گردنِ شبیرؑ پر تھا تو زبانِ حسینؑ پر آخری الفاظ یہ تھے۔ "کہ جو تو (یا اللہ) چاہے گا وہی ہوگا"۔ حسینؑ کا صبر اور سجدہ شکر، نہ صرف میرے لئے بلکہ کائنات کے لئے تعجب خیز ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جیسے پیغمبر کو جب سولی پر چڑھانے کے لئے بھیجا گیا تو صبر کا دامن پکڑے ہوئے ان کے ہاتھ بھی کانپتے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ وہ صلیب کے قریب پہنچے تو بے ساختہ پکار اٹھے۔ "اے اللہ! اے میرے خدا! تم نے مجھے کیوں بھلا دیا"۔ اسی طرح سقراط جیسے باہمت مرد کے پایۂ استقلال میں لغزش محسوس ہوتی ہے کہ جب زہر کا پیالہ ان کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کے اور دیگر عورتوں نے رونا پیٹنا اور واویلا کرنا شروع کیا تو وہ ان خواتین کی یہ حالت دیکھ نہ سکے لہٰذا انھوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے ان عورتوں کو دور ہٹایا جائے پھر میں زہر پیوں گا۔ اللہ اللہ حسینؑ! صبر و استقامت کا وہ پہاڑ ہے کہ جس کی کنکری کے ایک ذرہ میں بھی جنبش محسوس نہیں کی جا سکتی۔ حسینؑ نے اصولوں کی خاطر ہر آزمائش کا کھلے ہاتھوں استقبال کیا اور دنیا نے شہادت کی تاریخ میں وہ نقش ثبت کیا کہ جس کا نشان اس کے عزم کی طرح یکتا اور لافانی ہے۔ اہل شیعہ کو بالتحقیق یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ اپنے (بے مثال) پیشوا کے اس عظیم المیہ کی یاد جی بھر کر منائیں اور عالمین کے اس کبیر راہنما کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کے

تر و تازہ پھول پیش کریں مسلمانوں کی دنیا محسوس کرتی ہے کہ اسلامی کارہائے نمایاں میں جو کارنامہ حسینؑ نے انجام دیا ہے وہ پیاکوئی بھی دوسرا شخص انجام نہیں دے سکا ہے۔ وہ لوگ جو کہ مذہب شیعہ سے اختلاف رکھتے ہیں یا ہر سے مسلمان ہی نہیں وہ بھی اپنے عقیدوں سے ہٹ کر جب حسینؑ مظلوم کے مصائب سنتے ہیں اور ظلم کی داستان کی یہ تصویر ان کی نظروں سے گزرتی ہے تو ان تفصیلات سے ان کی حساس قلبی بیدار ہو جاتی ہے اور عقیدہ و ایمان نہ ہونے کے باوجود یہ فسانۂ غم انھیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتا جیسا کہ مشہور عیسائی مورخ گبن اپنی کتاب "ڈیکلائن اینڈ دی فال آف رومن امپائر،، میں لکھتے ہیں۔

"کہ ہر دور میں حسینؑ کی المناک شہادت سخت سے سخت تر دل رکھنے والے کو حسینؑ کی مظلومیت سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتی رہے گی ص۹،،۔

عزاداری یہ مسلمانوں کی تاریخ کا وہ باب ہے جسکی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے اور اس سالانہ یادگار کو دنیا بھر میں آباد شیعہ تعزیہ کا جلوس نکالکر قائم رکھتے ہیں۔ تعزیہ بنفسہ کچھ نہیں ہے لیکن کربلا کی کہانی کی ایک یادگار ہے۔ شیعہ لوگ اسے اٹھا کر گلیوں سے، شاہراہوں سے، قصبوں سے، دیہاتوں سے گزرتے ہیں۔ یہ لوگ نوحہ خوانی کرتے ہیں۔ اور مرثیے پڑھتے ہیں جن میں کہ امام حسینؑ، انکی مخدرات۔ اور بچگان پر ڈھائے گئے مظالم و ستم کی تفصیلات کا تذکرہ و بیان کیا جاتا ہے۔ شیعہ روتے

ڈھوتے ہیں۔ پیٹتے ہیں واویلا کرتے ہیں۔ اور جو لوگ امام حسینؑ اور ان کے اہل خاندان پر ظلم کرنے والے تھے یا اُن کو پہنچنے والے مصائب کے ذمہ دار تھے اُن کی پرزور نفرین کرتے ہیں اور جو طریقہ بھی اظہار مذمت و نفرت کے لئے ان کو موزوں نظر آتا ہے وہ اس کو اختیار کرتے ہیں۔ سُنی لوگ خود بھی امام حسینؑ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اور وہ یزید اور اس کے ساتھیوں کی کارروائیوں جو کہ انھوں نے قتل حسینؑ کے سلسلہ میں کیں ان سب کو ناپسند کرتے ہیں۔ مسلمانوں ہی میں ایک گروہ ایسا ہے جسے "ناصبی" کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اصل میں بنی امیہ کے پیروکار ہیں۔ اور پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ کے بارے میں نیک گمان نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کا صرف یہی ایک ایسا طبقہ ہے جسے یادِ شہادت حسینؑ کے منانے پر کوئی سبھی اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر یہ گروہ بالکل ہی آٹا میں نمک کے برابر ہے۔ اور اس علاقہ (جونپور) میں تو ان کا وجود بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ لہٰذا میری نظر میں ان لوگوں کے اعتراض کو قطعی طور پر کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

اس مقدمہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کیا شیعوں کو اپنے جلوس کو شہر کی شارع عام گزرگاہوں سے ماتم کرتے ہوئے، روتے پیٹتے ہوئے دف بجاتے ہوئے لے جانے کا قانونی حق حاصل ہے یا نہیں خصوصاً اس کیفیت میں جبکہ وہ اپنی نظموں میں حسینؑ کے قاتلوں پر لعنت بھی کرتے ہوں؟

"ماتمی جلوس کو برآمد کرنا شیعوں کا قانونی حق ہے"

مقدمہ کے اس گوشہ پر غور کرتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ مدعا علیہان

کے بیان کے ہر لفظ کو صحیح مان لینے کے باوجود بھی ان کا موقف ، ان کی وکالت ، ان کی شہادت ، اصول قانون کی رو سے میرے نزدیک اس قابل نہیں کہ وہ شیعہ مدعیان کے حقوق میں حائل ہو سکیں جیسا کہ اعلیٰ عدالتوں نے اس سلسلہ میں اپنے فیصلے صادر فرمائے ہیں معزز پریوی کونسل مقدمہ منظور حسین بنام محمد زمان مقدمہ نمبر 23 A.L.J.179 کی معائنہ رپورٹ اور فیصلے کے مطابق شہریوں کا ہر طبقہ یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنا مذہبی جلوس اپنے مذہبی طریقہ کار کے مطابق ریاست کی ہر گزرگاہ سے لے جا سکے۔ اس رپورٹ کے صفحہ ۱۸۰ پر معزز عدالت رائے دیتی ہے کہ: " یہ تنازعہ تقاضا کرتا ہے کہ عدالت اس بات کا فیصلہ کرے کہ مذہبی جلوس کو سرکار ہند کی سڑکوں پر سے جانا اور متعلقہ رسومات مروجہ کے مطابق گزارنا قانوناً جائز ہے یا نہیں ؟ عدلیہ کی مجاز و ذمہ دار شخصیتوں نے اس کی اجازت دینے پر اتفاق کیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا شارع عام گزرگاہوں سے مذہبی جلوس حسب رواج گزارنے کا کسی (شہری) کو حق حاصل ہے ؟ معزز عدالت نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ استحقاق جائز ہے۔ اس طرح کا تنازعہ شیعہ و سنی کے مابین اس وقت رونما ہوا جب اورنگ آباد کے قصبہ میں بہت سارے علموں کے ساتھ شیعوں نے ایک جلوس نکالا۔ حسن و حسین کی شہادت کی یاد منائی۔ شیعوں کا یہ جلوس قصبے کے پبلک مقامات اور راستوں پر آہ و زاری و ماتم

برپا کرتے ہوئے لے جایا جاتا تھا۔ سنیوں نے اس پر اعتراض کیا
اور پیٹنے پر جسے کہ اصطلاح میں "ماتم" کہتے ہیں پابندی
لگا دینے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہ موقف اختیار کیا کہ اُن کی
مسجد کے سامنے سے ماتمیوں کے گزرنے سے خلل واقع ہوتا ہے
پریوی کونسل کے معزز اراکین نے اس مقدمہ کی سماعت فرمائی
اور یہ فیصلہ دیا کہ: "ماتمی جلوس کو برآمد کرنا شیعوں کا قانونی
حق ہے۔ اور وہ رونے پیٹنے اور ماتم داری کرنے کے جلوسوں سے
روکے نہیں جا سکتے"۔ تاہم معزز اراکین نے یہ صراحت
فرمائی کہ "امن وامان کی صورت حال کے پیش نظر انتظامیہ کو
عارضی طور پر مخصوص وجوہات کی بنا پر پابندی لگا دینے کی اجازت
ہے"۔ اس عدالت نے خاص طور پر مدراس کے تین مقدموں کا
حوالہ دیتے ہوئے لکھا جن کے نمبر 304/5 مدراس، 203/6 مدراس
376/6 مدراس ہیں۔ بحوالہ 203 مدراس حکم یہ ہے کہ "ضلعی
انتظامیہ اور پولیس قانون کے نفاذ اور قانونی حقوق کی پاسداری
کے مددگار ہیں۔ تاہم ہنگامی صورت کے پیش نظر اگر وہ مناسب
سمجھیں تو وہ ان قانونی مراعات کو عارضی طور پر ترک کر سکتے
ہیں۔ عدالت عالیہ نے اپنے فیصلہ میں واضح الفاظ میں کہا کہ
"مجسٹریٹ کے ایسے احکامات جو قانونی حقوق پر پابندی
لگاتے ہیں ان کا اعتبار وحیثیت صرف خصوصی حالات کے پیش نظر
ہوگا۔ نہ کہ اس طرح کے عارضی احکامات عام قوانین کی شکل اختیار
کر لیں گے"۔ موجودہ مقدمہ زیر سماعت کے فریق مخالف اہل سنت

کا بڑا اعتراض قاتلان امام حسینؑ پر لعنت کرنے پر ہے۔ جو کہ زیر بحث جلوس کو نکالتے وقت اہل جلوس بقوے تعزیہ اٹھائے ہوتے بیٹھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے بر عکس کرتے ہیں جس سے کر سُنیوں کے نیز مسلمانوں کے ناصبی طبقے کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اس لئے عوامی گذرگاہوں پر اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے چنانچہ اس مسئلہ پر مذکورہ بالا بریویی کونسل کے ارکان نے اپنے اظہار فیصلہ میں صاف طور پر کہا ہے کہ صفائی (سُنیوں) کا موقف اس جہت سے منفی انداز اپنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ عدالت عالیہ نے شیعوں کو اس بات کی اجازت دی اور شیعوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ شیعہ سُنی زیر انتظام مسجد کے سامنے سے اپنے جلوس کو حسب رواج روتے پیٹتے ہوئے ماتم و سینہ کوبی کرتے ہوئے اور اپنی تمام مذہبی رسومات بجا لاتے ہوئے مسجد کے قریب گزرنے والی سڑک سے گذار سکتے ہیں۔ اس طرز عمل سے پیدا شدہ سنیوں کے لئے خلل اندازی اور ان کی عبادت میں بے توجہگی کا اثر کسی طور پر بھی حقوق شیعہ کو متاثر نہیں کر سکتا۔ پس شیعوں کا دعویٰ اور مطالبہ کسی بھی صورت سے نہ زمرہ جرائم میں آتا ہے اور نہ ہی پبلک یا پرائیویٹ علاقوں میں انتشار کا سبب بنتا ہے۔ ہائی کورٹ کی ایک معزز بینچ نے الہ آباد کے مقدمہ ۱۸۱ / 30 میں لکھا ہے کہ: "جہاں جائیداد کے عمومی حقوق کا سوال ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہاں ہمیں چاہیئے کہ کسی مراعات یا قانون کی سہولت دیتے ہوئے انفرادی طور پر متاثرہ فریق کے

حقوق کا لحاظ رکھیں اور ایسے کام یا ایسی دفعات جن سے کسی خاص طبقے کے جذبات کو ٹھیس لگے ان کو خصوصی طور پر عام حیثیت سے وجہ انتشار تسلیم نہ کریں"۔ یہی معزز عدالت دوسرے مقام پر رائے تحریر کرتی ہے کہ: "یہ ہر شخص کا قانونی حق ہے کہ اپنی جائیداد کو جس مقصد کے لئے چاہے استعمال کرے بشرطیکہ اس استعمال سے دوسروں کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچے اور نہ ہی کوئی قانون شکنی عمل میں آئے۔ تاہم مالک کو اختیار ہے کہ وہ کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کی پرواہ کرے یا نہ کرے۔

حقیقی اذیت اور دل آزاری

اس مقام پر عدالت عالیہ نے REAL INJURY (حقیقی اذیت دہی) اور ___ HURTING THE SUSCEPTIBILITY OF OTHERS (دوسروں کو جذباتی ٹھیس پہنچانا) کی صراحت فرمائی ہے۔ عدالت نے صاف طور پر لکھا ہے کہ: "اگر ایک شخص ایک کام کرنے کا قانونی حق رکھتا ہے تو وہ اسے بغیر اس بات کی پرواہ کئے کہ اس کام کے کرنے سے دوسرے افراد کی دل آزاری ہوگی کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا جس سے کہ دوسروں کو حقیقی طور پر ضرب یا جسمانی زخم پہنچے۔

گاؤ کشی

یہی معاملہ گاؤ کشی کا ہے ہندوؤں نے ذبح پر اعتراض کیا۔ اور یہ موقف اختیار کیا کہ گائے کو حلال کرنے سے ہندوؤں کے دل مجروح ہوتے ہیں۔

لہذا مسلمانوں پر گائے کو حلال کرنے کی پابندی وارد کی جائے۔
ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جہاں تک مذہب اہل ہنود کا تعلق ہے تو جذباتی دینی طور اعتبار سے ہندو برادری کا یہ حق بالذات MANU کے دستور سے ہے کہ برہمن کی زندگی اور گائے کی زندگی ایک برابر سمجھی جاتی تھی یعنی انھوں نے حیوان و انسان کو یکساں درجہ دیا۔ جس طرح ہندو قوانین کے مطابق برہمن کو مارنا جرم ہے اسی طرح گائے کو مارنا جرم ہے چنانچہ اس سلسلہ میں ہندو قوانین کے مطابق دی گئی سزائیں ناقابل فراموش ہیں۔ علاوہ ازیں ہندو مذہبی قوانین اور اصول، زیادہ تر ملک کی زرعی معاشیات کے اصولوں پر اساس رکھتے ہیں چنانچہ آج کے جدید ہندو ماہرین معاشیات یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اس ملک کے لوگوں کی غربت کے مسائل کا خاطر خواہ حل یہ ہے کہ ملک میں اچھی نسل کی گائے کی نسل افزائی کی جائے۔ یہ معاملہ روزمرہ کی عام زندگی کے مشاہدہ کا ہے۔ اہل ہنود نے ابتدا ہی سے رسماً اس سلسلہ میں گائے کا تقدس ملحوظ رکھا اور اس اصول میں شدت اختیار کی مگر باوجود اس جائز مذہبی اعتراض کے اور ہندوؤں کی پُرخلوص و عاجزانہ التماس کے معزز عدالت نے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھے بغیر وہ فیصلہ دیا جو مسلمانوں کے قانونی حق کے تحفظ میں تھا۔ یہ فیصلہ عدالت موصوفہ نے مقدمہ نمبر 30/181 الہ آباد میں جاری کیا اور یہی نظریہ کیس نمبر 6/101 کا رد میں ظاہر کیا گیا۔ اسی

نوعیت کا ایک اور مقدمہ الہ آباد کی عدالت کو ۱۹۳۰ء میں سُننا پڑا جو حسبِ ذیل مرقوم ہے کہ آنریبل سلیمان اور سین (J J) نے لکھا کہ: " اگرچہ گائے کی قربانی ہندوؤں کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جُرم لگتی ہے تو اس کام کو قانونِ عام کے برعکس قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ قانون کسی کے ذاتی پسند و ناپسند جذبات کو ملحوظ خاطر نہیں لاتا بلکہ اس کا نفاذ عمومی ہوتا ہے "۔ اسی ضمن کے اور ایک کیس میں آنریبل سلیمان اور ینگ (J J) نے کہا کہ ہندوؤں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے سماجی یا مذہبی جلوس ہر سڑک، گلی، بازار، شاہراہ عام سے ڈھول باجوں کے ساتھ اپنے مذہبی رسومات بجالاتے ہوئے مسجدوں کے قریب سے گزار سکتے ہیں اور مسجد سے متعلقہ محمڈن لوگ (مسلمان) یہ حق ہرگز نہیں رکھتے کہ وہ ایسے مقامات پر جلوس کو روکنے کا مطالبہ کریں یا ایسی کوئی کارروائی کریں کیونکہ اس طرح کی رکاوٹ یا پابندی پھر اُسی طرح ہندوؤں کے لئے دل آزار ہوگی جس طرح کہ مسلمانوں کے لئے اب ہے "۔

چنانچہ معزز عدالت نے اس مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

عبادت گاہوں کے سامنے سے جلوس گزارنا

" ماجدا ور مندر جو کہ گزرگاہوں پر واقع ہیں ان میں لیکن عبادت گزاروں کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شرکاء جلوس

کو مجبور کریں کہ وہ اپنے شادیانے مسجد یا مندر کے قریب سے گزرتے ہوئے بند کردیں کہ وہ اندر عبادت میں مصروف ہوتے ہیں بلکہ ایسا میوزک چاہے وہ مذہبی ہو یا نہ ہو اور وہ کسی بھی طبقہ یا اہل مذہب کے نزدیک قابل اعتراض ہو۔ قانون کی نگاہ میں ایسے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور معترضین کو ایسا اعتراض کرنے کا قانونی حق ہی حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح کی موسیقی کو بند کرانے پر اہل جلوس کے جذبات اسی طرح مجروح ہوتے ہیں جس طرح کہ اب پابندی عائد کرنے کا مطالبہ اٹھانے والوں کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں اس طرح کے جلوسوں کو قطعی طور پر روکا نہیں جا سکتا"۔ اسی فیصلہ کے دوران ایک اور مقام پر معزز عدالت فرماتی ہے کہ "ہر طرح کی موسیقی اچھی یا بری کسی طرح بھی عمومی انتشار یا خصوصی انتشار پیدا نہیں کرتی البتہ اس سے گلیوں، بازاروں میں رہائشی مکانات کے مالکوں کو تکلیف ہو سکتی ہے"۔ انھوں نے مزید کہا: "ڈھول باجوں کے ساتھ جلوس نکالنا چاہے وہ مذہبی نوعیت کا ہو یا نہ ہو یہ بات شہری حق میں داخل ہے جو ہر کسی اقلیت کو ہوتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاہراہ عام کو عبادت گاہ کے مترادف سمجھ کر استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ ہر فرقے کے لوگ عام گلیوں میں اپنے جلوس گزار سکتے ہیں بشرطیکہ وہ وہاں گزر رہاں کے باشندوں کو کسی طرح کی مداخلت" کی شکایت کا موقع نہ دیں۔ چنانچہ زیر بحث تنازعہ میں معترضین

کو اس قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اہل جلوس نے گزرتے ہوئے کسی طرح کی مداخلت کر کے ان کو نالاں کیا ہو۔ نہ ہی مدعیان نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ان کے جلوس میوزک اور لعن یا طبل اور تاشہ کے لئے گلیوں میں اہل محلہ کوئی مزاحمتی دخل اندازی پیدا کرتے ہیں بلکہ مخالف فریق کا شکوہ صرف یہ ہے کہ سارا کچھ اسلام کے برعکس ہے جسے بجا لاکر شیعہ جون پور کے سنیوں اور ناصبیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ اعلیٰ عدالتوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کے اعتراض قطعاً بے بنیاد ہوتے ہیں اور ان قانونی حقوق کے سامنے ان کی کچھ حیثیت نہیں ہوا کرتی جو کہ عوام الناس کے لئے عمومی طور پر ملک کی سرزمین پر نافذ کئے جاتے ہیں۔ لہذا میں شہادت و حقائق کی بنیاد پر تحریر کرتا ہوں کہ مدعا علیہان کے تمام اعتراضات مذہبی یا جذباتی کیفیات پر مبنی ہیں جو کہ بے اساس و بے وقعت ہیں۔ ایک اور مقدمہ جو ۱۹۴۳ء میں پیچ ڈویژن نے آنریبل مکرجی اور ریلینٹ (JJ) نے سنا جس کا نمبر ہے 6. ALJ ہے اور اسے 639 صفحہ پر نقل کیا گیا ہے۔ عالی جناب مکرجی تحریر کرتے ہیں کہ "قانونی عدالت میں بنیادی طور پر کسی مقدمہ کا فیصلہ شہری حقوق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اور شہری حقوق کسی صورت سے کسی کے کسی بھی قسم کے جذبات کے تابع نہیں ہوتے جو کہ ملک میں آباد ہوں۔ عدالت لکھتی ہے کہ: "ملک میں آباد ہر شہری کو اپنی طرز پر عبادت کرنے کا حق ہے۔ ہر کوئی اپنے طریقہ کار سے

جلوس نکالنے کا مستحق ہے۔ بشرطیکہ اس کے ایسا کرنے سے کسی دوسرے کے شہری مدنی حقوق برباد نہ ہوں۔ صفحہ ۶۴۹ پر معزز عدالت کی وضاحت مرقوم ہے کہ اس قسم کی کارگذاری جو کہ عمومی یا خصوصی انتشار کا سبب ہو وہ غیر قانونی ہوگی۔ عمومی انتشار کی تشریح تعزیرات ہند کی دفعہ 68 رہ میں موجود ہے اور معزز عدالت نے اس دفعہ کا تجزیہ بڑے محتاط انداز میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ: "اس قسم کی دفعات کو عمومی طور پر شنیوں نے اپنی توجہ کا مرکز ٹھہرایا ہے مگر وہ دراصل ان کے حقیقی معنوں سے دور ہٹ گئے ہیں۔ اور ان کا اعتراض عمومی انتشار سے منطبق و موافق نہیں قرار پاتا ہے"۔ محترم عدالت صفحہ مذکورہ ہی پر یہ لکھتی ہے کہ: "اس معاملہ پر جو کچھ بھی کہا جائے بہر حال حقیقت یہ ہے کہ مدعیوں کا موقف از خود ایک نئی پیچیدگی اور مشکل پیدا کرتا ہے کیونکہ جب یہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ تب بھی ان کے اختیار کردہ موقف کے مطابق دفعہ 68 رہ تعزیرات ہند انہی کے خلاف جاتی ہے۔ جب ہم اس دفعہ کو غور سے پڑھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تکلیف دہی یا ناگواری" در حقیقت مذکورہ دفعہ کا مقصد و مطلب نہیں ہے۔ یعنی لوگوں کے مذہبی خیالات یا مختلف نظریات جو دوسروں کے برعکس ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہر مخالف کو دوسرے کا نظریہ برا لگے گا اور اس سے اس کے ذاتی جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ حالانکہ قانونی شکل اس طرح کی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ معزز عدالت نے اس طرح کے

دل آزاری نوعیت کے مقدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مذہبی جذبات کی بنیاد پر پیدا شدہ ناپسندیدگی یا ناگواری یا دل آزاری ہرگز دفعہ 268 تعزیرات ہند کی مراد نہیں ہے۔ اس قسم کے فیصلوں کی اصولی اساس مجموعی طور پر عمومی قوانین ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہر آدمی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی املاک کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ بشرطیکہ اس کا طریقۂ استعمال دوسرے شہریوں کے قانونی حقوق کی چھینا جھپٹی نہ کرے۔ چنانچہ اس کی صحیح وسعت و حدود جو اس ملک میں نافذ ہیں کافی حد تک اور تسلی بخش طریقہ کے ساتھ مذکورہ بالا مقدمات کے فیصلوں میں بیان کی جا چکی ہیں۔ جن میں یہ سارا قانون پوری طرح زیر بحث آیا ہے۔ اور مدراس ہائی کورٹ کے تین مقدموں 309/5، 203/6، 376/کر میں اس قانون کے ہر گوشہ پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ پریوی کونسل کے لائق عزت اراکین نے ان تمام فیصلوں کو مصدقہ قرار دیا ہے جیسا کہ رپورٹ 179۔ J۔L ۔A 3 ۲۲ کا حوالہ گزشتہ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ عدالت عالیہ کے ان معزز ارکان نے بمبئی کے اس مقدمہ پر بھی اپنا اظہار رائے پیش فرمایا جو موجودہ نظریہ کے برعکس ہے۔ مدراس کے محولہ بالا مقدمات کے فیصلے مکمل طور پر اس مقدمہ زیر سماعت عدالت ہذا کے مدعیان کے حق کی حمایت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرزمین ہند پر ایسا کوئی قانون موجود نہیں ہے کہ جس کے مطابق سُنّی مدعا علیہان

کو یہ حق نہ دیا جا سکے کہ وہ شیعہ مدعیان کے بارے میں اس شکایت پر کہ مدعیان کے عمل سے ان کے مذہبی احساسات اور سنیوں ناصبیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھوکر لگتی ہے اور شیعوں کا یہ طرز عمل مذہبی لحاظ سے اُن کے لئے باعث تکلیف ہے اس لئے ان پر پابندی لگائی جائے۔!

اس سلسلہ میں کافی کچھ کہا جا چکا ہے۔ لہٰذا بیان کردہ فیصلوں کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچی کہ تمام گزرگاہیں عوام کے کسی مکتب فکر کے مذہبی یا سماجی جلوس میونک اور الحانی شور و فغاں یا کوئی اور طریقہ کار جو بھی رائج ہو جس طرح کہ اس مقدمہ میں مستغیث فریق نے استدعا کئے ہیں کے لئے ممنوع قرار نہیں دی جا سکتی ہیں۔ پبلک گلی یا سڑک اصل میں پبلک ہی کے استعمال کے لئے ہوتی ہے۔ اس طرح کے شارع عام (جیسا کہ اوپر بیان کئے گئے ہیں) کی روشنی میں عوام کے ہر طبقہ کو قانونی طور پر برابر کا حق حاصل ہے کہ وہ عام گلی شاہراہ کو ان مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کر سکے جو کہ درخواست گزاروں نے مطالبہ کئے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے بڑی سنجیدگی سے بحث کی ہے ہم اس کی نوعیت اور وسعت قانون ارضی کے مطالعہ کی مدد سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قانونی نکتہ جو اس میں قابل توجہ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جیسے ہم مندرجہ ذیل قانونی تصریحات قائم کر کے اب بیان کرتے ہیں۔ اور ان کا جائزہ ان فیصلوں کی روشنی میں لیتے ہیں جو اس طرح کے معاملات میں عدالتوں نے کئے ہیں۔

میں ان ہی فیصلوں کو اپنے اس کیس کی بنیاد قرار دینا پسند کرتا ہوں

"شارع عام سے جلوس گزارنا پبلک کا حق ہے"

(۱) پبلک کے ہر طبقے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا مذہبی یا سماجی جلوس اپنی رسم و رواج کے مطابق جن میں موسیقی، تقاریر، تشید[۱] جو کچھ بھی وہ اپنے اس مقصد کی بجا آوری کے لئے مناسب خیال کریں کے ساتھ سڑکوں یا گلیوں پر سے گزر سکتے ہیں۔ (بحوالہ نمبر 23، 180، 179 ALJ سنہ 1931ء، ALJ: 354 و 357 سنہ 1931ء، ALJ: 624)

کوئی طبقہ جلوس نکالنے پر اعتراض کرنیکا مجاز نہیں ہے

(۲) پبلک کا کوئی بھی دوسرا طبقہ اس طرح کے جلوس نکالنے پر اعتراض کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ چاہے اہل جلوس کی مذہبی یا دیگر تقاریب یا موسیقی یا تشید یا تقاریر جو کچھ بھی اس طرح زیر عمل ہوں اور یہ طرز عمل اعتراض کرنے والوں کے مذہبی عقائد کے برخلاف ہو اور اس سے ان کے مذہبی احساسات کو ٹھیس پہنچتی ہو۔ یا کسی کی دل آزاری ہوتی ہو۔ عوام کے کسی بھی طبقہ کے اس نوعیت کے اعتراضات اس صورت میں قابل توجہ ہو سکتے ہیں جب جلوس، مذہبی مراسم یا موسیقی یا تقاریر عوامی انتشار کا

---

۱ آواز کی بلندی، شعر کے جواب میں شعر، گیت، ترانہ

موجب ہوں یا ارضی قانون کے مطابق جرم کی نوعیت رکھتے ہوں۔
یا قانونی حقیقت پر مبنی کسی حقیقی نقصان وہ سبب کے پیدا کرنے کا باعث ہو۔ (بحوالہ 1931، 23 و 179 ALJ، 624 ALJ 431، 181، الہ آباد 354/ALJ 30 صفحہ 639 سے (64)

قانونی تجزیہ کا منطقی نتیجہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ آیا شیعوں کے وہ افعال جن پر کہ فریق مخالف نے اعتراض کیا ہے کیا کسی حقیقی عوامی تکلیف کا باعث ہوتے ہیں؟ وہ زمرۂ جرائم میں شمار ہو سکتے ہیں؟ یا ان افعال سے مدعا علیہان کے اصلی حقوق فی الواقعہ مجروح ہوتے ہیں؟ — قانونی نقطۂ نگاہ سے تو زیادہ سے زیادہ مستغیث کے افعال کو اگر بالفرض محال جرم تصور بھی کر لیا جائے تو یہ جرم کسی حالت میں بھی قانون ارضی کی دفعات میں سے کسی دفعہ کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ بلکہ دفعہ 268 رذ تکلیف دہی 153/A سے 295A اور 298 تعزیرات ہند کے تحت فرض کئے جا سکتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں ان دفعات کا تجزیہ کروں کہ آیا یہ دفعات بھی اس قسم و نوعیت کے تنازعات میں لاگو ہوتی ہیں کہ انہیں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان حقائق کو منکشف کروں جو مقدمہ کے شواہد سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ اور دیکھا جائے کہ شیعوں کے جن افعال پر اہل صفائی نے اعتراض کیا ہے ان کی صحیح نوعیت کیا ہے۔ بحق مدعا علیہان

کے یہ کہہ دینے سے کہ شیعوں کو اپنے جلوس ماتم و نوحہ خوانی و طبل و تاشہ کے ساتھ نکالنے کا حق نہیں ہے۔ بات نہیں بنتی ہے۔ ہاں ان لوگوں کو اصل اعتراض شیعہ کی طرف سے تبرّا یہ ہے یعنی قاتلین حسینؑ کی بد تعریفی کرنا یا ان کے تین خلفاء کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا اور یہ بات ہر صحیح الدماغ شخص کے نزدیک ایک اہم نکتہ ہے جو کہ فیصلہ طلب ہے۔ حاضرین کے بارے میں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ معاملہ آسان نہیں ہے۔

تبرّہ اور بیزاری

میں اس سے قبل اسلامی تاریخ کے ابتدائی زمانے کی تفصیلات بیان کر چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ کن تاریخی سانحہ جات اور بنیادی اختلافات نے شیعہ و سُنّی یا ناصبی فرقوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ چنانچہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ شیعہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ پہلے تین خلیفے ابو بکر، عمر اور عثمان بلا استحقاق مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے جبکہ خلافت کا اگر کوئی صحیح حقدار ہے تو وہ علی بن ابیطالب کی ذات تھی۔ اہل تشیع کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے تینوں خلیفے علیؑ، اولادِ علیؑ اور اہلبیت رسولؐ کے حریف تھے اور یہ کہ اُن کے عہد حکومت میں یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ اہل بیت نبیؐ کے حقوق کو دبایا جائے (حقیقی وارث تخت) علیؑ کو شدائد میں مبتلا رکھا

جائے چنانچہ اسی پالیسی کے نتیجے میں کربلاَ کا المناک واقعہ پیش
آیا۔ لہذا اس راسخ نظریہ کے باعث شیعہ ان تینوں حضرات
کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں۔
اور اپنا اصلی دشمن سمجھتے ہیں اس لئے وہ ان سے برائت کرتے
ہیں یہ بات اسلامی تاریخ میں ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک
ہے کہ حسینؑ ایک ممتاز ترین شخصیت تھے مسلم عقیدہ کے مطابق
بہت بڑے ہیرو تھے، ہو سکتا ہے وہ میدان سیاست کے شہسوار
نہ ہوں یا سرکاری لحاظ سے شکستہ خوردہ ہوں۔ ان کا
صائب الرائے نہ ہونا یا فیصلہ کرنے میں خطا کر جانا اور ان میں
ظاہری قابلیت کا فقدان ہونا بھی بیان کیا گیا ہے جیسا کہ
ایک فرانسیسی مصنف مسٹر مارلس ایچ لامنس نے ان خامیوں
کو ان سے منسوب کر کے لکھا ہے۔ اور ان پر ایسے الزامات
و اتہامات وارد کئے ہیں مثلاً یہ کہ وہ ضرورت سے زیادہ
سیدھا سادہ شخص تھا اور ان میں سیاسی چالاکی و ہوشیاری
نہیں تھی وغیرہ جس طرح کہ بعض مورخین نے بیان کیا ہے لیکن
یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ امام حسینؑ مسلمانوں کی تاریخ میں
متفقہ طور پر ایک مقدس ترین بزرگ اور بہت بڑے روحانی
ہیرو مانے گئے ہیں۔ اور اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا
ہے کہ وہ پیغمبر کے نواسہ اور آنحضرتؐ کے چہیتے اور آپ کو بہت
زیادہ محبوب تھے اور ان ہی سے رسولؐ کا شجرۂ نسل جاری ہوا۔
اُن کو ایسے حالات میں تہ تیغ کیا گیا کہ جن کا بیان سنکر پتھر سے پتھر دل

موم کی مانند پگھل جاتا ہے اور کربلا کی المناک کہانی دردناک قصہ سب کو غم وحزن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شیعہ عقائد میں سے یہ ایک نمایاں عقیدہ ہے کہ حسینؑ خلیفہ برحق تھے۔ وہ اپنے پدر بزرگوار علیؑ کے جانشین اپنے برادر عالی قدر کے ولیعہد تھے۔ جبکہ معاویہ بن ابوسفیان ایک باغی وغاصب حکمران تھا جس نے غیر منصفانہ طریقہ سے بد عہدی کر کے اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کو بادشاہ بنا دیا۔ اس کے حامیوں نے اسلام اور اہل بیتؑ رسولؐ اسلام کے ساتھ بے انصافی کی۔ شیعوں کے بیان کردہ نظریات معتبر ترین تاریخی حقائق سے سچے ثابت ہوتے ہیں۔ اس بات میں تو رتی برابر شبہ نہیں ہے کہ معاویہ جو کہ محمدؐ اور ان کے اسلام کے بدترین دشمن ابوسفیان کا بیٹا تھا اور پھر اس کا بیٹا یزید بن معاویہ ہمیشہ ہی پیغمبرؐ اسلام اور آپؐ کے مشن کے خلاف رہے۔ ان لوگوں نے چند مصلحتوں کی خاطر پیغمبرؐ کے دین اور آپؐ کے اقتدار کی مضبوطی کو دیکھتے ہوئے کلمۂ اسلام پڑھا۔ چنانچہ اس بات کا اظہار وہ آزادانہ طریقے اور کھلے الفاظ میں خود کر دیا کرتے تھے یزید اور معاویہ کا کردار، ان لوگوں کے سیاہ کارنامے تاریخ اسلام کی معتبر کتابوں میں موجود ہیں — اور قتل حسینؑ — تو بلاشک وشبہ انسانی دلوں کو چکنا چور کر دینے والا ان کا وحشیانہ قدم ہے۔ معاویہ وہ شخص تھا کہ جس نے خلیفہ اول ابوبکر کے بیٹے محمدؒ کو گدھے کی کھال میں بند کر کے زندہ جلا دیا تھا۔ معاویہ وہ منافق آدمی تھا جس نے حضرت عائشہ کو اپنے

ہاں کھانے کی دعوت پر بلوایا۔ ایک گہرے گڑھے کے اوپر کرسی
رکھ کر ان کو اس پر بٹھایا جسے نیچے سے کھینچ لیا گیا اور بی بی صاحبہ
کو ہلاک کر دیا۔ صرف اس معمولی وجہ پر کہ بی بی عائشہ نے معاویہ
کے بیٹے یزید کی نامزدگی پر اعتراض کیا تھا اور اس کی مخالفت
فرمائی تھی۔ ان حقائق کی روشنی میں اور تاریخی مواد کی موجودگی
میں اس نتیجہ پر پہنچ جانا فطری امر ہے کہ معاویہ، یزید اور قاتلانِ
حسینؑ انتہائی گرے ہوئے آدمی تھے چنانچہ میرا بیان کہ وہ
یہی نظریہ شیعہ ان لوگوں کے بارے میں رکھتے ہیں۔ شیعہ اس
اس نظریہ پر ماضی میں کئی صدیوں سے چلے آ رہے ہیں ان کی نفرت
جو سینکڑوں سال پرانی ہے آج صدیوں بعد کسی کے لئے دل آزاری
نہیں بن سکتی ہے شیعوں کے نزدیک یزید "قتل حسین" کا
پہلا مجرم ہے اور پہلے تین خلیفے اصل اصول کے لحاظ سے اس
ناگہاں جگر پاش واقعہ کے معاون ہیں۔ چنانچہ شیعہ جو اپنے تعزیہ
کے جلوس نکالتے ہیں ان میں روتے ہیں، سینہ زنی کرتے ہیں
پیٹتے ہیں۔ یہ رواج ایران و ہندوستان میں باقاعدگی کے ساتھ
سولھویں صدی سے جاری ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کتاب "گولڈن
ڈیڈز آف امام حسین ص۱ اور ص۲۔ یہ ایک تاریخی معاملہ ہے
کہ اس سے کچھ لوگ انکار بھی کر سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ
ایک عام تجربہ و مشاہدہ بھی ہے یہ جانی پہچانی حقیقت ہے اور
ہم میں موجود ضعیف العمر لوگوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ تعزیہ
داری۔ آہ و زاری، ماتم داری کے جلوس شروع ہی سے برآمد

ہوتے آرہے ہیں اور ہم بچپن ہی سے شیعوں کو ان رسومات کو بجا لاتے ہوئے دیکھتے چلے آرہے ہیں تعزیہ اس کے سوا کیا ہے ؟ کہ شہدائے کربلا کی مزار مقدس کی شبیہ ہے ۔ مرثیے میں روتے پیٹتے ہوئے واقعات کربلا کے حالات کی نظمیں پڑھی جاتی ہیں جن میں مختلف قسم کے ایسے دل سوز، جگر خراش اور ہمدردی خواہ وقعے بیان کئے جاتے ہیں جن میں اُن حالات کی تفصیل ہوتی ہے کہ حسینؑ اور ان کے بہتر ساتھیوں کو یزید کی کثیر التعداد فوج نے کس طرح طرح عالم بے کسی میں موت کے گھاٹ اتارا۔ یہ شیعہ لوگ ننگے پاؤں، برہنہ سر اپنے سینوں کو پیٹتے ہوئے اپنے اس ہیرو کے غم میں شدت کے ساتھ مبتلا ہو کر جلوس کی شکل میں سڑکوں اور بازاروں میں آجاتے ہیں ۔ کیا ہم میں سے کوئی ایک بھی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ شیعہ لوگ یہ سارا کچھ محض ایک ڈرامہ کھیل رہے ہیں ؟

رسومات عزاداری کھیل تماشہ نہیں ہے

چاہیے کہ ان کا مقصد سُنّیوں یا ناصبیوں کے احساسات کو مجروح کرنا یا ان کے جذبات کو ٹھیس لگانا یا کسی کی دل آزاری کرنا یا کسی کو چڑانا ہے ۔ ایسا ہرگز نہیں ۔ کوئی شخص بھی اس بات پر یقین نہ کرے گا ــــ شیعہ اپنا جلوس لے جاتے وقت روتے ہیں ان کے ساتھ شبیہیں اور مقدس نشانات علم وغیرہ ہوتے ہیں وہ مصیبت کے حالات کی کہانی،

اس سانحہ کے اسباب اور المناک حادثات کی روئیداد بیان کرتے ہیں۔ یہ شیعہ تاریخ کا دردناک باب ہے۔ جس کا منطقی نتیجہ محض یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف حسینؑ کے قاتلوں کی اور ان پر ڈھائے گئے ظلم کی مذمت کا اظہار کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور وہ لوگ جو ظلم سے بھرپور اس حادثہ کے ذمہ دار ہیں، ان کے خلاف احتجاج ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ان آدمیوں کی مذمت اور ظالموں سے نفرین کے بغیر شہادت امام حسینؑ کی یادگار منائی جا سکے۔ کیونکہ اس کے بغیر احتجاج کا مقصد مکمل طور پر غیر موثر رہ جاتا ہے۔ کسی ڈرامہ کی تصویر اس وقت تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس کی کہانی کے واقعات کو مناسب طریقہ کے ساتھ اس کے اصلی رنگ میں پیش نہ کر دیا جائے۔ آپ قتل حسینؑ کے واقعہ کی یادگار اس کے بغیر کیسے منا سکتے ہیں جب تک کہ آپ ان آدمیوں کے کردار کو واضح نہ کریں جنھوں نے کہ ان کے قتل میں حصّہ لیا نیز یہ نہ بتائیں کہ وہ مجرم کس خصلت کے آدمی تھے؟ اور یہ کہ وہ لوگ قابل نفرت تھے یا نہیں۔

قاتلین حسینؑ کی مذمت

الغرض یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیعوں کا یہ شعار کہ وہ قاتلان حسینؑ کی مذمت کرتے ہیں اور ان کے فعل بد پر ان کو برا کہتے ہیں تو ان کے ایسا کرنے سے تین خلیفوں پر زد تنقید پڑتی ہے۔ شیعہ عقائد کی گہری جڑیں

اور ان کے ایمان کی مستحکم بنیاد جو کہ صدیوں پرانی روایات سے ثابت ہے معترضین کے موقف کے برعکس ہیں کسی پر لعن طعن کرنا اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے کہ ایک حقیقت کے لئے تاثرات کا اظہار ہے کہ خدا اس قماش کے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے۔ یہ خیر محض بارگاہ ربانی میں ایک دعا ہے کہ وہ ذات عادل ایسے ظالموں کو قرار واقعی سزا دے۔ چنانچہ لعنت کرنے میں قاتلان حسینؑ یا تین خلفاء کو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاتا اس کے ہوا شیعوں کے لئے اور کونسی پرامن راہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے ان تاریخی زخموں کے خلاف جو کہ ان کے بزرگوں پر بڑی کمینگی اور ناانصافی سے لگائے گئے کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور میں روز آخرت کا انصاف طلب کریں۔ چنانچہ یہ ایک الگ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے جو شیعہ کہتے ہیں۔ درآنحالیکہ یہ شیعوں کا حق ہے جیسا کہ میں وضاحت کے ساتھ پہلے بیان کر چکا ہوں۔ علیٰ ھذا میں ان لوگوں میں کا ایک شخص ہوں جو اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہوں کہ "اللہ کی بارگاہ میں استدعا کرنا کہ وہ ایسے برے لوگوں سے اپنی اچھی رحمت کو دور رکھے"، کو ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی سزا تو نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ ایسا ناممکن ہے کہ یہ یقین ہو کہ خدا لازمی طور پر یہ بددعا منظور کریگا جو کہ شیعہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ پیغمبر خود روز قیامت اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لاکر اس معاملہ میں دخل اندازی کریں گے۔

المختصر مجھے ایسی کوئی مضبوط بنیاد دستیاب نہیں ہوتی جس کی بنا پر سُنّی یا ناصبی محض ایک تخیلاتی امر یا دعاگوئی کے باعث اپنی طرف سے کوئی مذہبی اعتراض وضع کر سکیں۔ جہاں تک دیگر سُنّیوں کے اعتراضات کا تعلق ہے جو کہ انہوں نے اپنے تحریری بیانات میں لکھے ہیں، جنہیں میں گذشتہ صفحات میں دُہرا چکا ہوں انھیں نکتہ وار ایک ایک کر کے میزان جائزہ پر جانچیں۔

لعن و طعن

(۱) سُنّیوں کی پہلی شکایت یہ ہے کہ شیعہ جلوس نے جاتے وقت خفیہ طور پر تینوں خلیفوں پر لعنت کرتے ہیں جو کہ غیر قانونی ہے اور اس بات کی ان کو اجازت نہ ہونا چاہیئے —— یہ سنیوں کا خود اپنا اقرار ہے کہ یہ کام شیعہ پوشیدہ طور پر کرتے ہیں اس طرح کہ اُن کی آواز ڈھولوں کی آواز کے شور میں گم ہو جاتی ہے اس طرح وہ سارے راستے تمام دُنیا میں حسینؑ کے قاتلوں پر لعنت کرتے ہیں اور سنیوں کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ شیعوں کو تین خلفاء پر شارع عام قابل ملامت لعن کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ میرے خیال میں یہ اعتراض بالکل غیر سنجیدہ ہے کیونکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر وہ بات کہے جو اس کے حقہ میں آئے خواہ دوسرے لوگ اس کو سن رہے ہوں۔ اس بحث کے لئے نکتہ بالکل صاف ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ جس طرح ادھر بیان کیا گیا کہ شیعہ کو استحقاق پہنچتا ہے کہ وہ تین خلیفوں

سے بے زاری اختیار کریں کیونکہ اُن کے پُر خلوص اور جانے پہچانے
مذہبی عقیدے کی رُو سے وہ اسی قابل ہیں۔ لہٰذا سُنیوں
اور ناصبیوں کو اُن پر اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں
جبکہ نہ ہی اس طرزِ عمل سے ان کی کوئی مذہبی دل آزاری
ہوتی ہے نہ ان کے جذبات کو ٹھیس لگ سکتی ہے۔ علیٰ
ھٰذا القیاس عام گزرگاہوں اور پبلک شاہراہوں پر اونچی
آوازوں میں خلیفوں پر شیعوں کا لعن کرنا (قانوناً) جائز
ہے۔ انھیں اس بات کا حق حاصل ہے (جبکہ یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے نہ ہی یہ توضیح

عذر رشتہ داری پیغمبرؐ

کہ قاتلوں میں سے کچھ لوگ حضرت علیؑ یا حضرت رسول خداؐ کے رشتہ دار تھے
یا یہ کہ وہ بھی کلمہ گو مسلمان تھے تو یہ اس کی بنیاد نہیں بنتی
کہ ان پر لعنت نہ کی جائے جبکہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہ قتل حسینؑ میں
ملوث تھے اور واقعی مجرم تھے۔ اس طرح تو ابوسفیان اور معاویہ
بھی رسولؐ کے دُور کے رشتہ دار ہوتے ہیں کیونکہ یہ سب عرب
کے ایک ہی قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اس قرابتداری
کے باوجود ان لوگوں نے ساری زندگی اسلام اور پیغمبرؐ اسلام
کو تباہ و برباد کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ رشتہ داری کی اس حقیقت کے سہارے ان کی مخالفانہ

۱؎ سسرالی رشتہ قریبی تھا کہ ابوسفیان حضورؐ کا سسر اور معاویہ سالا تھا۔

کارروائیوں کی مذمت نہ کی جائے۔؟

ناصبی طبقہ

(۳) اس قصبہ میں ناصبی آبادی کا وجود مشکوک ہے۔ میرا فہم ہے کہ ناصبیوں کے وجود کا مسئلہ اس وجہ سے وضع کیا گیا ہے کہ جہاں تک مذہب سُنّیہ کا تعلق ہے اس کی رُو سے شاید ہی کوئی مذہبی جواز یا قانونی اساس ایسی ہو جس کی بنا پر شہدائے کربلا کے قاتلوں پر لعنت کرنے پر اعتراض کرنے کا عذر تلاش کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ مقدمہ ھذا میں شیعوں نے تین خلیفوں پر لعنت کرنے کی اجازت طلب نہیں کی ہے (کہ جس پر تنازعہ ہو) لہذا اس معاملہ میں شیعہ کے خلاف کوئی ممانعت وارد نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ قاتلانِ حسین پر لعنت کریں کیونکہ خلفاء مذکورین کا اس میں کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ رہ گیا سُنّیوں کے خدشے کا تعلق تو سُنّی حضرات اس سے محفوظ و بے خطر ہیں۔

تحریری بیان میں سُنّی فریق نے یہ بات بالوضاحت بیان نہیں کی ہے کہ جونپور کے علاقہ میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو کہ ناصبی کہلواتا ہو اور وہ معاویہ و یزید کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہو۔ انھوں نے صرف اشارۃً فرض کیا ہے کہ جونپور میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو یزید اور دیگر قاتلین حسین کو اپنے دینی بزرگ قرار دیتا ہے اور یہی مفروضہ ان کے زعم میں نقصِ امن کے خدشہ کا سبب ٹھہرا ہے۔ اس ضمن

میں صرف ایک گواہ عبدالعزیز نامی پیش کیا گیا ہے جس نے خود کو شیعہ بنی امیہ سے منسلک کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی جماعت کے دشمن یعنی شیعہ (امامیہ) ان کو ناصبی کہتے ہیں۔

عبدالعزیز کہتا ہے کہ وہ یزید کو اپنا امام اور خلیفہ مانتا ہے اور دیگر قاتلین حسین اور یزید کے مددگاروں کو غازی مجاہد اور انصار تسلیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ان سات اشخاص پر کہ جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے یا ان میں سے کسی ایک شخص پر بھی لعنت کی جاتی ہے تو اس کے اور اس کے ہمنواؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اس سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ گواہ مذکور کا دعویٰ ہے کہ جونپور میں اس کے ہم خیالوں کی تعداد ایک ہزار سے بارہ سو تک موجود ہے۔ یہ شخص ایک مدرسہ میں بیس روپئے ماہوار کا معمولی ملازم ہے۔ اور یہ چندہ جمع کرنے کا کام کرتا ہے۔ یہ اس سے پہلے اہل سنت کے زیر انتظام ایک یتیم خانہ میں دس روپئے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رہا ہے۔ یہ گواہ کوئی معتبر شہادت یا کوئی کتابی معتبر ثبوت نقلی پیش نہیں کر سکا ہے۔ جس سے اس کا عقیدہ اس ہی کی جماعت یا طبقہ سے ثابت ہو سکے۔ بعض دوسرے گواہوں نے بھی جونپور میں ناصبیوں کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے چنانچہ اس گوشہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ رسم تبرا بازی جونپور میں کافی برسوں سے جاری ہے اور ماضی کے اس طویل عرصہ میں کبھی کسی ایک بھی ناصبی نے شیعوں کے خلاف یہ شکایت

متعلقہ حکام بالا تک نہیں پہنچائی ہے کہ اس رسم کو بند کیا جائے۔
یہ سب قضیہ آج ہمارے نئی زیر سماعت ہے کہ کچھ شیعان بنی امیہ
نے امامیہ شیعوں کے خلاف یہ مطالبہ اٹھایا ہے کہ اُن کو اجازت
مرحمت کی جائے کہ وہ ایسا جلوس برآمد کر سکیں جس میں امام حسین
کے قاتلوں کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی کی جاسکے۔ صرف
ایک سال پہلے گواہ عبدالعزیز کو اس کا احساس ہوا ہے اور
اس نے ایسا جلوس نکالنے کا خیال سوچا ہے۔
چنانچہ ان تمام اُمور نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ لکھنؤ
میں نواصب کے وجود کا موقف اور ایسے طبقہ کی موجودگی کہ جو
یزید اور اس کے ساتھی قاتلین حسین کو اپنا رہبر مانتا ہو ناقابل
یقین بات ہے۔ چنانچہ میں محققانہ بنیاد پر اس بات کو مسترد
کرتا ہوں کہ لکھنؤ میں نواصب یا اس طرح کے عقائد کی حامل
کوئی جماعت وجود پذیر ہو۔ بالفرض محال اگر یہ تسلیم کر لیا جائے
کہ لکھنؤ میں ایسے لوگ رہائش پذیر ہیں جو کہ یزید کو اپنا پیشوا
مانتے ہیں اور قاتلین حسین پر لعنت کرنے سے ان کے مذہبی
احساسات مجروح ہوتے ہیں تو میری رائے میں شہری قانون کے
اصول کی روشنی میں معترضین کے اس قسم کے اعتراض کی کوئی اہمیت
یا وقعت نہیں ہو سکتی ہے۔ اور ان لوگوں کو اس بات کی اجازت
ہرگز نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ شیعوں کے مسلمہ قانونی حقوق

ھ؎ یہ ہندوستان میں ۱۹۳۵ء کی بات ہے اب انکا وجود پاکستان میں ملتا ہے۔

میں مداخلت کریں ۔ میں نے مدعا علیہان کے اس شہادتی بیان کا بغور مطالعہ کیا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہے ۔ ان کا پورا موقف اور شہادتیں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شیعوں نے جن قانونی حقوق کا مطالبہ کیا ہے ان کو پورا کرنے سے ان کی دل آزاری ہوگی جس سے نقص امن کا اندیشہ ہے اور اسی بنیاد پر سنی چاہتے ہیں کہ شیعہ مدعیان کے مطالبوں کو رد کر دیا جائے ان کو اس کا خیال نہیں ہے کہ اس صورت میں اہل شیعہ کے حقیقی قانونی حقوق پر آنچ آتی ہے ۔ پھر مدعا علیہان اپنے موقف کے سلسلہ میں یہ یقین بھی ظاہر نہ کر سکے کہ شیعہ طرز عمل سے اُن کے اپنے حقوق پر کیا ضعف ہوتا ہے نیز یہ کہ سنی اس بات کو بھی واضح نہ کر سکے کہ ان کو کیا حقیقی نقصان پہنچتا ہے اور اس مضرت کا ثبوت فراہم کرنے سے قاصر رہے ہیں ۔ حقیقی نقصان سے قانونی مراد یہ ہے کہ اصلی، واضح و قطعی ایسا عملی نقصان جو ارضی قانونی حق کو محسوس ہو ۔ جو نظریاتی، جذباتی یا مذہبی حق نہیں ہے ۔ جیسا کہ میں بیان صدر میں اس نکتہ پر سیر حاصل روشنی ڈال چکا ہوں اور اپنی بات کو دو عدالتی فیصلوں کی تقویت سے مستحکم کر چکا ہوں ۔ پس مدعا علیہان کے موقف کو اس نکتہ کی رو سے سمجھنا کامی ہوتی ہے ۔

کیا عزاداری خلافِ اسلام ہے اور مذہبِ شیعہ میں عزاے حسینؑ حرام ہے؟

(۴) اعتراضات کی چوتھی اور آخری شق تعزیہ داری ہے جس میں تمام مراسم عزاداری شامل ہیں یعنی ماتم و سینہ زنی رونا آہ و بکا کرنا ترنم و موسیقی وغیرہ۔ جن چیزوں کو نہ صرف خلافِ اسلام قرار دیا گیا ہے بلکہ مذہب شیعہ کے اعتبار سے بھی ناجائز بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ شیعوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اِن ممنوعہ مراسم کو بجالائیں۔ مگر میں پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ عام طور پر شیعہ اپنے اس عقیدہ میں بڑے حقیقت پسند واقع ہوتے ہیں جس کے تحت انھوں نے درخواست گزاری کی ہے یعنی عزاداری ان کے مذہبی نظریات کا اٹوٹ انگ ہے کسی سول کورٹ کے فیصلہ کرنے کے مقاصد کے لئے یہی امر کافی ہے کہ مدعی فریق ایک حقیقت پسندانہ عقیدہ کے حامل ہیں مجھے اس بات کا فیصلہ نہیں کرنا ہے کہ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط۔ اور یہ بات غیر اہم ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی نظریات کے برعکس ہے یا مذہبِ شیعہ کی تعلیم کے خلاف ہے۔

شیعہ کتب کے حوالے

قبل اس کے ہم متنازعہ کے اس پہلو پر گفتگو کا اختتام بذریعہ کریں میں

چند مقتدر و معتبر حوالہ جات پیش کرنا پسند کرتا ہوں جن کے باعث میری تشفی ہوئی کہ شیعہ عقائد مذہبی اس معاملہ میں مباحثہ کھولنے والے اپنے حق میں کافی اور مفید مواد رکھتے ہیں جس سے ہم بآسانی اخذ کر سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کے عقائد و نظریات حقیقت پسندانہ و دیانتدارانہ ہیں اور ممتاز مذہبی مقام کے حامل ہیں۔

امام رضاؑ نے فرمایا ہے جو شخص جو کی شراب اور شطرنج کو دیکھ کر امام حسینؑ کو یاد کرتا ہے اور یزید اور اس کے پیروکاروں کو بد دعا دیتا ہے تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دے گا چاہے وہ گناہ اتنے ہوں جتنے ستارے ہیں!

(بحار الانوار جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۴)

ریان بن شبیب کی ایک اور مرضی حدیث ہے کہ اس میں وارد ہوا ہے کہ جو کوئی جنت میں جانے کا متمنی ہو تو اسے چاہیئے کہ حسینؑ کے قاتلوں پر لعنت بھیجے۔

(کتاب مذکورہ صفحہ ۱۸۵)

اسی سلسلہ کی ابو عبداللہ سے ایک اور روایت جو اسی صفحہ پر ہے ہم اسی مصنف (علامہ مجلسیؒ) کی روایات میں یہ بھی پاتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا "اللہ حسینؑ کے قاتلوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے اور ان کے دوستوں اور مددگاروں کو بھی نیز ان کو بھی جو ان ملعونوں کے لئے بددعا نہیں کرتے۔ بغیر کسی اچھی وجہ کے!! ہمیں شیعوں کی ایک معتبر کتاب میں

یہ ملتا ہے کہ "حسین ابن علیؑ کربلا میں سنان بن انس کے نشانہ سے مارے گئے، اللہ ان لوگوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے۔ اور خدا، رسولؐ خدا اور امام پر اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوتا ہے جبتک کہ ہمارے دشمنوں سے ناراضگی و بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ ہمارا ایمان ہے کہ نبی و امام کے قاتل بے ایمان ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ (اعتقادیہ شیخ صدوق رح)

ایک اور روایت بھی ہے جو مصیر الجنان میں جعفر بن محمد بن نما نے لکھی ہے کہ مرض الموت کے زمانہ میں جب آنحضرت کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو آپؐ نے امام حسینؑ کو اپنے سینہ مبارک سے چمٹا لیا اور فرمایا مجھے یزید سے کیا، نہ تو فکر نا چاہیئے اللہ اس کو برکت نہ دے۔ اے خداوندا! یزید کو اپنی رحمت سے دور رکھ۔ حضورؐ اشکبار تھے اور فرما رہے تھے کہ ہاں میں اور حسینؑ کے قاتلین روز قیامت خدا کے حضور آمنے سامنے ہوں گے۔" اگلی روایت میں یہ ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا میرے خدا تو اس حسینؑ کے قاتلوں اور ان لوگوں کو جو ان کے دوست ہوں اور ان کے اس عمل پر رضامند اور خوش ہوں اور اس فعل کو سنکر قاتلوں کی حمایت کرتے ہوں ان سب کو اپنی رحمت سے دور رکھ۔ (زاد المعاد صفحہ ۱۸۳) اسی کتاب کے صفحہ ۵۹۲ پر اسی مضمون کی اور روایت بھی مرقوم ہے۔

ان حوالہ جات اور اس قسم کے دیگر مواد سے ثابت ہوتا ہے

کہ یزید اور حسینؑ کے دیگر قاتلوں پر لعنت کرنا شیعہ اکابرین کے نزدیک از روئے حدیث جائز و متفق ہے۔

"ہر جزع و فزع ممنوع ہے سوائے عزائے حسینؑ کے"
(من لا یحضرہ الفقیہ صفحہ ۱۷۹)

بحار الانوار جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۸ پر امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ جس میں محرم کا سوگ منانا۔ رونا پیٹنا اور عزاداری سید الشہداء بجالانا جائز ثابت ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۷۱ پر روایت کیا گیا ہے کہ جب امام حسینؑ کی ولادت ہوئی تو مولود کو حضورؐ کی گود میں دیا گیا۔ پیغمبرؐ اس وقت روئے اور اسماء سے فرمایا کہ ہم ایک المناک خبر سناتے ہیں۔ اور کہا یہ بچہ قتل کیا جائے گا۔ اور فرمایا اللہ اس کے قاتلوں پر لعنت کرے۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی یوں ہے کہ میں اپنے اس فرزند (حسینؑ) پر اشکبار ہوں کہ اس کو اسلام کے باغی کافروں کا ایک گروہ قتل کر دے گا۔ جو بنی امیہ میں سے ہو گا۔ روز قیامت میں ان مقتولوں کی ہرگز شفاعت نہ کروں گا۔ اے اللہ محبوب رکھ ان دونوں (حسنینؑ) کو اُن کو بھی جو ان دونوں سے محبت رکھیں۔ لعنت کر ان پر جو ان دونوں سے دشمنی رکھیں۔ چاہے وہ زندہ ہوں یا مر گئے ہوں۔

کتاب ذخیرۃ المعاد میں صفحہ ۶۲۵ پر مرقوم ہے کہ امام حسینؑ کی عزاداری جائز ہے جس میں رونا پیٹنا، ماتم کرنا دف بجانا، سر پیٹنا یا دیگر آلات موسیقی سے سوگ منانا شامل

ہے۔ علاوہ ازیں شیعہ کی کتب اربعہ کی کتاب من لایحضرہ الفقیہ جلد ۱ صفحہ ۵۷ پر بھی اس مضمون کی روایت موجود ہے۔ مزید برآں روضۃ الصفا کے صفحہ ۹۷ پر حدیث منقول ہے کہ احد کے موقع پر شہادت حمزہؓ پر حضورؐ نے خواہش فرمائی کہ خواتین مدینہ جناب حمزہؓ پر ماتم داری و نوحہ خوانی کریں چنانچہ انہوں نے رات گئے تک عزاداری کی جسے آنحضرتؐ نے پسند فرمایا حتیٰ کہ ان عورتوں کو دعائے خیر سے نوازتے ہوئے فرمایا "اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تمہاری اولاد و اولاد اور آئندہ نسلوں کو بھی راضی رکھے۔"

یزید ملعون ہے

تذکرۃ الخواص الامہ کے صفحہ ۱۵۴ پر لکھا ہے کہ حسینؑ اسلام کی راہ حق میں شہید ہیں اور اس کتاب کے صفحہ ۱۶۲ پر تحریر کیا گیا ہے کہ مستند و معتبر طور پر یزید مردود اور ملعون ہے اور یہ کہ یزید اور دیگر قاتلین حسینؑ لعنت کے قرار واقعی مستحق ہیں۔ میں اس سلسلہ میں یہاں پیغمبرؐ کی مشہور و معروف حدیث کا حوالہ دینا چاہتا ہوں کہ جس میں کہا گیا ہے کہ جہاد قسطنطنیہ میں شریک تمام لوگ مغفور ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ یزید بھی اس مہم میں شریک تھا لہٰذا یزید پر لعنت کرنا اس حدیث رسولؐ کے منافی عمل ہے اور شعار اسلام کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس پر لعن کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی مغفرت نہ ہو۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۶۲ پر یہ بھی ہے کہ قول رسولؐ مرقوم

ہے کہ جو کوئی اہل مدینہ کو خوف زدہ کرے اس پر خدا کی فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہو گی۔ اس کا نہ قیامت کو کوئی عمل قبول نہ ہو گا۔ چنانچہ اس مقام پر صاحب کتاب (سبط ابن جوزی علامہ اہل سنت والجماعت) نے اس قول کو بخاری شریف کی حدیث مغفور سے متصل کر کے کہا ہے کہ اس ارشاد نبوی کے مطابق ہر وہ شخص جو مدینہ کی حرمت کو برباد کریگا جہنم میں جائے گا۔ ابن جوزی نے اس حدیث مغفور کو حضرت ابو ایوب انصاری کی شان میں بیان کیا ہے اور یزید سے اس کے تعلق کو مسترد کر دیا ہے۔ کتاب تذکرۃ الخواص الامۃ سنی مکتب فکر کی ہے اور مدعی کو یہ حدیث حرمت مدینہ کے بارے میں تمام مسلمان متفق ہیں کہ یزید نے مدینہ پر چڑھائی کر کے وہاں کے باشندوں میں تباہی مچا دی۔ لہذا حدیث نبوی کے مطابق یزید جہنمی قرار پایا۔ اس نص کے اعتبار سے اگر شیعہ لوگ یزید پر لعنت کرنے کا عقیدہ رکھتے ہیں جو کہ اس مقدمہ زیر سماعت میں باعث نزاع ہے تو میری صوابدید کے مطابق وہ اپنے موقف پر حق بجانب ہیں۔

شیعہ گواہان

مدعیان نے اپنے حق میں کل پانچ گواہان پیش کی ہیں پہلے گواہ عبد الغفور ہیں۔ جو ایک مذہبی خطیب ہیں۔ انہوں نے شیعہ و سنی دونوں مکتبوں کی کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تائید کرتے ہیں کہ اس مقدمہ میں مدعی موقف کا ہر گوشہ مذہب اسلام کے عین مطابق

ہے۔ گواہ موصوف نے اپنے بیان شہادت کے صد۶ پر پُر زور الفاظ میں وثوق کے ساتھ کہا ہے کہ مسلم دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو کہ حسین علیہ السلام کو قتل کرنے والوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہو۔

دوسرے گواہ طالب حسین ایک ممتاز زمیندار ہیں جو حکومت کو سالانہ سات آٹھ سو روپیہ آبیانہ ادا کرتے ہیں۔ یہ شیعہ مسلک رکھتے ہیں اور گواہ اوّل کی تائید کرتے ہیں اپنے شہادتی بیان کے صد۲ پر لکھتے ہیں کہ جو بورہیں شیعان بنی اُمیّہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔

تیسرے گواہ سید فضل علی ہیں جو مذاہب اسلامیہ میں خاصی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں انھوں نے بھی مدعیان کی موافقت میں گواہی دیکر ان کے موقف کو تقویت پہنچائی ہے۔

چوتھے گواہ فصاحت حسین ہیں جو کہ ۲۸۷ روپئے انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی مدعیان کی حمایت کی ہے۔

پانچویں اور آخری گواہ مظفر حسین ہیں یہ شیعوں کی با رسوخ شخصیت ہیں۔ انھوں نے مختلف کتب کے حوالوں سے مدلل اثبات کے ساتھ مدعیان کے عقائد کو سچا ثابت کیا ہے۔

یہ سب گواہ مذہبی طور پر شیعہ ہیں جبکہ مدعا علیہان کے تمام شہادتی سُنی مسلک کے پیروکار ہیں۔ مدعیان کی زبانی گواہی کا وزن جہاں تک میرے ذہن نے محسوس کیا مقابلۃً مدعا علیہان کی شہادت سے بھاری ہے شیعوں کی طرف سے پیش ہونے

والے اکثر گواہان آعلےٰ حیثیتوں کے حامل افراد ہیں۔

سنی گواہ

فریق مخالف کی جانب سے کُل آٹھ گواہ آئے۔ پہلے ایوب صدیقی، ایک سُنی عالم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نام لے کر کسی پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جونپور میں کچھ ناصبی لوگ آباد ہیں۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ تعزیہ کا جلوس اور عزاداری سے متعلق دیگر مراسم سب کی سب شیعہ مذہب کے اعتبار سے ممنوع و حرام ہیں۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ تمام قاتلانِ حسین بدکار لوگ تھے۔ یہ صاحب ۲۸ روپے ماہوار کے تنخواہ دار معمولی آدمی ہیں۔

دوسرے سُنی گواہ مولوی علی حسن ہیں۔ یہ اس کیس میں مدعا علیہ بھی ہیں انھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے گواہ نے کہا۔ کوئی فاضل معتبر بات نہیں کی ہے جس سے کہ ان کے بیان کردہ موقف کی تصدیق ہو سکے۔

تیسرے گواہ نے اصل موضوع پر کچھ نہیں کہا ہے وہ صرف یہ کہنے حاضر ہوئے کہ شیعوں کو ان سے کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے۔ اسی طرح گواہ ۴، ۵، ۶ مدعا علیہان بھی ہیں۔ انھوں نے عدالت میں پیش ہونے کی زحمت صرف اس لئے اٹھائی کہ وہ مقدمہ میں وجہ نزاع سے کسی ذاتی تعلق کا انکار کر سکیں۔

گواہ ۷ حکیم محمد یٰسین ایک سُنی عالم ہیں۔ انھوں نے ایک سچے مسلمان کے اصولی عقائد پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جونپور میں ناصبی بھی مقیم ہیں لہٰذا اس بنا پر ان کا بیان کسی

بھی حالت میں قابل اعتبار نہیں۔!

گواہ نمبر ۸ عبدالعزیز ہیں جو کہ خود کو ناصبی ظاہر کرتے ہیں اور میں ان کے بارے میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں

عقیدے کے صحیح و غلط ہونے کا فیصلہ کرنا عام عدالتوں کا کام نہیں!

میں اس امر پر مجمل بحث کر چکا ہوں کہ فریقین کی گواہوں کے بیانات جن کا تعلق عقائد سے ہے اس معاملہ میں کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں

یہ عدالت یا اس معاملہ سے منسلک کوئی اور سول کورٹ مسلم نظریہ کی جانچ پرکھ کے لئے منعقد نہیں ہو سکتی ہیں کہ وہ فیصلہ کریں کہ شیعہ عقیدہ یا سنی عقیدہ میں کونسا صحیح ہے اور کونسا غلط ہے۔ اور نہ ہی اس زیر سماعت تنازعہ میں اس گوشہ پر گفت و شنید کی ضرورت ہے کہ ایسا فیصلہ کیا جائے۔ سب فریقوں نے اپنی اپنی دستاویزی شہادتوں اور مستند اسلامی کتابوں سے اپنے اپنے عقائد پیش کئے ہیں اور ہر ایک نے دوسرے کو غلط قرار دیا ہے۔ اندریں حالات صحیح و مناسب طریق کار یہی ہوگا کہ ہم یہ اخذ کریں کہ آیا شیعہ نقطہ نظر سے ان کے مذہبی جلوس اور دیگر حقوق جس کا کہ مطالبہ کیا گیا ہے اُن کے مذہبی عقائد سے مطابقت رکھتے ہیں یا یہ محض ڈھونگ ہیں کہ جنکی بجا آوری سے ان کی نیت غیر شیعہ کے

مذہبی جذبات اور نظریاتی احساسات کو ٹھیس لگتا ہے، اگر مدعیان ہماری تسلی کر دیتے ہیں جیسا کہ انھوں نے تشفی کن طور پر ایسا کیا ہے (اس کیس میں) کہ وہ یہ مراسم عرصہ دراز سے بجالا رہے ہیں اور اس سلسلہ میں کافی معتبر شیعہ اتھارٹیوں کے حوالے پیش کئے ہیں کہ تعزیہ داری اور تبرہ اور دیگر شعائر مذہبی اُن کے عقائد میں کافی پرانے ہیں۔ لہٰذا ایسی معقول اور ناقابل انکار صورت میں عدالت انصاف پر لازم آتا ہے کہ وہ اُن کے ان حقوق کی حفاظت کرے۔ قطع نظر اس بحث کے کہ وہ عقیدے کسی بھی طور پر غلط، غیر منطقی اور احمقانہ ہی کیوں نہ سمجھے جاتے ہوں۔ ان عقائد کی جانچ پرکھ کرنا اور صحیح وغلط کی تمیز میں الجھنا عدالت ھذا کے لئے بے مقصد اور بے وقعت ہوگا۔

شیعہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کرتے!

بہرکیف نوعیت حالات کے مطابق یہ کہنا ناممکن ہے کہ شیعہ یہ سارا کچھ محض فضول یا بلا مقصد کرتے ہیں یا وہ کسی مروجہ قانون تعزیری کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرکے جرم کرتے ہیں پس شیعہ کے ایسے مراسم کی بجا آوری و ادائیگی کو ہرگز تکلیف دہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آنریبل حکم جی نے اس نکتہ پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے اور ہم نے فیصلہ ھذا کی تحریر بالا میں صفحہ ۶۳۸ سے صفحہ ۶۴۲ تک کا حوالہ بحوالہ مقدمہ 642/ ALJ ۱۹۳۱ء پیش کیا ہے

مگر میں نے اس کے علاوہ بھی متعلقہ تعزیری دفعہ کا بغور جائزہ لیا ہے اس کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا ہے اور متعلقہ قانونی مختارو کا مطالعہ کیا ہے جس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی بھی صورت سے شیعوں کا موقف کسی شرارت پسندی یا قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی سے منسلک ہوتا نظر نہیں آتا ہے جیسا کہ مخالف فریق کا گمان ہے پس اس معاملہ میں مدعا علیہا کے موقف کو درست سمجھ لینا میرے لئے ناممکن ہے جیسا کہ میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ حقائق کا انکار غیر امکانی امر ہے اور یہ بات ہرگز درست نہیں ہے کہ شیعہ کسی مکتب فکر کا دل دکھانے کے لئے اپنے مذہبی مراسم ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ شیعہ یہ سب کچھ اپنے امام کی یادگار شہادت منانے کے لئے کرتے ہیں۔ شیعہ کے اس طرز عمل سے اگر کسی طبقہ کو ناگواری محسوس ہوتی ہے اور کسی کے مذہبی احساسات مجروح ہوتے ہیں تو یہ جذباتی دل آزاری و ناپسندیدگی قانونی ضرورت کے لحاظ سے ہرگز کافی نہیں کہ محض اس بے بنیاد جواز پر کسی کو اپنے مذہبی رسومات منانے سے روک لیا جائے یا اس طرز عمل کو کسی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا جائے۔ دفعہ ۱۵۳ الف کو ایک طرف رکھتے ہوئے شرانگیز یا سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت مذہبی احساسات کو مجروح کرنا ایک الگ جرم کا اہم جزو ہے۔ جو کہ تعزیرات ہند کی دفعہ 295-اے، اور 298 میں بیان ہوا ہے۔ جبکہ ان مذکورہ دفعات کا اس مقدمہ میں شیعوں پر اطلاق نہیں

نہیں ہوتا۔ جہاں تک دفعہ A 153 کا تعلق ہے ہم نے نوٹ کیا ہے کہ دئیے گئے بیان میں مذکورہ دفعہ کی شراب کو نیلام کرنے کا حیلہ کیا گیا ہے جب کہ تقریری و تحریری اثبات و دیگر شواہد سے ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں کسی قسم کی کوئی شرارت بدنیتی یا بددیانتی نہیں ہے بلکہ یہ خالصتہً ایماندارانہ نظریات پر منحصر ہے۔

رسالہ ورتمان، سیر دوزخ اور رنگیلا رسول کے مقدموں کی مثالیں!

(بحوالہ 1927/46 154 C.L.J) اور اسی طرح کی رولنگ رسالہ ورتمان کے کیس 27 AIR لاہور 594 میں عالی جناب بڑاٹھورے اور کمپ جج نے دفعہ A. 153 التعزیرات ہند کے ایک مقدمہ میں صحیح فیصلہ دیتے ہوئے حکم جاری کیا اور لکھا کہ دیگر مذاہب کے بارے میں نیک نیتی سے اظہار رائے کرنا شر انگیزی سے بعید ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ اس سلسلہ کا ہے جبکہ ایک مضمون بعنوان "سیر دوزخ" کے سلسلہ میں شکایتی دعویٰ پیش ہوا جس میں کہ ہتک آمیز طریقہ سے پیغمبر اسلام کی سوانح پر گستاخانہ حملے کئے گئے تھے۔ اور ان کی ازواج اور اصحاب کے لئے نازیبا انداز میں گستاخانہ کلام کیا گیا تھا۔ صاحب مضمون نے رسول، ان کی ازواج اور اصحاب سب کو

مردود قرار دیتے ہوئے درو زتی بیان کیا تھا اور سخت اذیت پہنچانے والا طرز اختیار کیا تھا۔ اس نے بڑے بھونڈے اسلوب میں بدمزگی پیدا کرنے والے طریقہ کے ساتھ (اور چرب زبانی کرتے ہوئے پیغمبرؐ کے بارے میں لکھا تھا کہ آنحضرتؐ شفاعت کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ اپنے پیروکاروں (اُمت) کی شفاعت کر سکیں۔

چنانچہ یہ کیس ویسی نوعیت کا نہیں ہے کیونکہ شیعہ جو کچھ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے رہبر کی شہادت پر روتے ہیں۔ اور اس شدتِ غم و رنج سے مغلوب ہو کر وہ اُن کے قاتلوں کی اپنی زبانوں سے مذمت کرتے ہیں جس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ یزید اور اس کے ساتھی جنہوں نے امام حسینؑ کو تہ تیغ کیا اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دور رکھے۔ ان لوگوں پر خدا کی لعنت برسے۔ کیا یہ طرز بیان گالی ہے؟ فحش کلامی ہے؟ بدزبانی ہے؟ رسوا کرنا ہے؟ برا بھلا کہنا ہے؟ چنانچہ لاہور کی رولنگ کے مطابق معزز منصفان نے تحریر فرمایا۔ "یہ یقیناً ایک مقصد ہے بلکہ ملزم کے مقصد کا جزو لاینفک ہے کہ ایسے احساسات میں زیادتی پیدا کی جائے اور اگر یہ اصل مقصد کا حصہ نہیں تھی تو وہاں دشمنی کے جذبات پیدا کرنے یا منافرت کی فضا ہموار کرنے کے لئے یہ چیز کافی نہیں ہے۔ معزز عدالت نے اپنی تحقیقات میں یہ تسلیم کیا اور ہماری ایک اور اعلیٰ عدالت میں دو ججوں

کیس جو کہ الہ آباد میں 1927/649 کے تحت زیر سماعت آیا یہ لکھا
گیا کہ یہ چیز لازماً ملحوظ رکھی جائے کہ ایسے ممالک میں جہاں کہ مذہبی
آزادی ہو وہاں اس قسم کے واقعات کا رونما ہونا ایک ضروری
امر ہوتا ہے وہ اپنے اپنے نقطہ نظر سے اپنے مذہبی نظریات کا اظہار
کریں۔ اور اس میں دیگر مخالف مذاہب پر رواداری تنقید
کا ہو جانا ناگزیر ہوتا ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ تمام وجوہات
کے تحت یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ رواداری کی جو تنقید کو مطلوب ہے۔
بد زبانی یا بد تمیزی کی اجازت نامہ نہیں ہونا چاہئیے۔ لاہور
ہائی کورٹ کے بینچ نے ان الفاظ کی تردید نہیں کی تھی جو کہ عزت
مآب دلیپ سنگھ (جج) نے تحریر کئے تھے جب ان کے سامنے
رسوائے زمانہ کتاب رنگیلا رسولؐ کا مقدمہ فیصلہ کے لئے
پیش ہوا تھا۔ یہ کیس ملک میں جذباتی ہیجان پیدا ہونے سے
پہلے ۱۹۲۷ء میں نمبر 590 کے تحت نمٹایا گیا جو کہ اس
کیس میں مدعیوں کے موقف کی حمایت کرتا ہے۔ وی جیترا
جیون صاحب کے فل بینچ کے فیصلہ بابت کیس AIR 1927
الہ آباد 649 عدالت نے فیصلہ دیا کہ کالی چرن شرما نے
اپنی کتاب میں جو زبان استعمال کی ہے وہ غیر شائستہ
ہے اور اس نے اس میں پیغمبرؐ کو شراب خور، بدکار، اوہام پرست
جنسی عیاش اور بہیمیت کا رسول لکھا (بحوالہ صفحہ نمبر ۶۵) اور
اس کی ساری زبان تحریر انتہائی گھٹیا، اشتعال انگیز،
بازاری، فحش، لچر اور کمینگی سے بھرپور تھی۔ چنانچہ اس بنا پر

فاضل عدالت نے اس کے برخلاف بالکل صحیح فیصلہ دیا مگر اس
کے باوجود دلیپ سنگھ کے فیصلے کو اس سے مختلف قرار نہیں
دیا جا سکتا اور اس کیس (کالی چرن) میں تعزیرات کی استغاثے
کے باوجود محترم جج دلال نے دلیپ سنگھ کے فیصلہ کی حمایت
نہیں کی بحوالہ الہ آباد 659 1927 A.I.R. - مگر میں پہلے بیان
کر چکا ہوں کہ ملزم کا طرز بیان چونکہ قابل اعتراض تھا جو کہ متفقہ
امر تھا جبکہ میرے زیر سماعت موجودہ کیس میں اس قسم کی
کوئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ
مدعیان کسی قسم کا کوئی جرم کرتے ہیں یا کسی قانون کی خلاف
ورزی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اس مقدمہ میں قانون کا کوئی عمومی پہلو ایسا نہیں ہے
جو اس موضوع پر مفید حیثیت سے پیش کیا جا سکے۔ (یعنی
جس سے شیعوں کی کوئی قانون شکنی ثابت ہو سکے) مدعیان
کے مطلوبہ حقوق عام قانونی حقوق ہیں اور عدالتی رولنگ کے
علاوہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ وہ عام انسانی اصولوں کے لحاظ سے بھی
CONSTITUTIONAL LAW
جائز ہیں۔ دیکھئے اپنے آئین
(آئینی قانون کی چھٹی جلد کے صفحہ 445) By DECAY Vol VI

پر اس موضوع پر بحث کی گئی ہے جس میں مرقوم ہے کہ: یہ ہر
شہری کا مشترکہ قانونی حق ہے کہ وہ شارع عام جگہوں پر اپنی
رائے کا اظہار کر سکے چاہے کوئی بھی موضوع سخن ہو
لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ایسا کرنے سے کسی قانون کی

خلاف ورزی نہ ہوئی ہو۔ کسی اجتماع کے مجتمع ہونے کا حق اور اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کسی بھی موضوع پر کرنا ہر شہری کا انفرادی و اجتماعی طور پر پیدائشی حق ہوتا ہے۔ فرد واحد یا افراد کا مجموعہ یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی پبلک مقام سے گزریں، گلی کوچہ و سڑک پر سے نکلیں کیونکہ یہ اسی مقصد کے لئے وقف و مخصوص ہوتی ہے لیکن کیا عوامی راستوں، سڑکوں، اور گلیوں پر آمد و رفت کا مطلب چپ و ساکت و خاموش رہنا ہوتا ہے؟ ہر آدمی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ سڑک پر چلتا ہوا بول سکے پھر جلوس اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسانوں کا ایک متحرک اجتماع ہوتا ہے پس ایسے جلوس کا وہی حق ہوگا جو کہ ایک فرد واحد شہری شخص کا کسی عام گزرگاہ یا راستے پر ہوتا ہے۔

"قاتلانِ حسینؑ پر لعنت کرنے پر اعتراض کرنا عقلمندی کی بات نہیں"

سات قابل مذمت افراد پر لعنت کرنا جن سے کہ مدعیان نے جرم کی نسبت کی ہے۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو امام حسینؑ کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہ لعن و طعن ماسوا اس کے کچھ نہیں کہ ان کے تاریخی تجربے کرداروں کے برخلاف اپنی رائے کا اظہار ہے۔ اگر یہی اظہار رائے کسی تبلیغی مقصد کے لئے کیا جائے اپنے مذہب کی وضاحت کرنے کے لئے یا ایک عظیم شہید

معیرہ کی شہادتِ عظمیٰ کی یاد منانے کے لئے یا مذہبی تقریبات منعقد کرنے کے لئے تو میرے نزدیک اس بات پر اعتراض کرنا عقلمندی کی بات نہ ہوگا۔ باوجود اس کے کبھی کہ یہ باتیں کسی طبقہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں یا کسی گروہ کے احساسات ان سے مجروح ہوتے ہوں۔ یا کسی کی دکھتی رگ پھڑکتی ہو یا پبلک کو ناگوار ہو پس مدعیوں کا حق ان ساری مخالف باتوں پر دونوں طرح غالب آتا ہے۔

تنازعہ نمبر ۳ دولت ہند کے سکریٹری اس مقدمہ میں ضروری فریق نہیں ٹھہرتے کیونکہ ضلع کی ذمہ دار انتظامیہ نے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۴۴ کے تحت کارروائی کی وہ اس لحاظ سے مجبور ہو گئے کہ انھوں نے حکام بالا کی تعمیل کی یعنی سکریٹری ہند کا حکم بجالائے۔ اور میں اس جھگڑے کا منفی فیصلہ دیتا ہوں۔

تنازعہ نمبر ۴ اس کیس میں مدعیان کا مدعا یہ ہے کہ مدعا علیہان مستغیثان کے حقوق سے انکار کرتے ہیں اور وہ متعلقہ حکام سے نوٹس جاری کروانے کے ذمہ دار ہیں جس میں کہ انھوں نے ان کے شہری آزادی کے حق میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ لہٰذا اس وجہ سے مدعیان نے مدعا علیہان کے خلاف مقدمہ داخل کیا۔ مدعا علیہان نے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے اور اپنی پوری کوشش سے تمام پہلوؤں پر مدعیان کے حق کا انکار کرنے میں کوئی کسر

اٹھا نہ رکھی۔ مقدمہ کی کارروائی کافی طویل ہوئی ہے۔ ابتدائی طور پر اسے فاضل سول جج نے سماعت کیا اور بقیہ ذمہ داری میرے کاندھوں پر آئی۔ مجھے یہ موقع حاصل ہوا کہ میں نے اس کی ساری کارروائی کا جائزہ تقریباً دو ہفتے لیا ہے۔ میرے خیال میں فضا کشیدہ صورت رکھتی ہے کہ سب لوگوں سے پانچ سے پچاس آدمیوں سے بلکہ بعض اوقات پر ہر مکتب فکر کے لوگوں کی زیادہ تعداد سے اتنی بھیڑ لگ جاتی ہے کہ کمرہ عدالت بھر جاتا ہے چنانچہ میرے ذہن میں یہ خفیف سا شبہ ہے جو کہ تقریباً ۳ ماہ سے پہلے پیدا ہوا ہے کہ اہل سنت طبقہ اس سلسلہ میں زیادہ بیتاب ہے کہ شیعوں کے حقوق کا انکار کر دیا جائے۔ مدعی گواہ وضاحت سے اعتراف کرتے ہیں کہ سنیوں نے مقامی انتظامیہ کو شیعوں کے طبل و تاشہ کے خلاف شکایت کی اور متعلقہ حکام نے زیر دفعہ ۱۴۴ ایف ٹس کے تحت پابندی لگا دی۔ مدعا علیہ کے گواہ محمد ایوب کے بیان سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مدعا علیہان مدعیوں کے حقوق کا انکار کرنے میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

دَرحقیقت مدعا علیہان کی تین گواہیوں کے سوا انہوں نے کہ کچھ نہیں کہا ہر ایک نے مدعیان کے حق سے انکار کیا ہے ہمیں خاص طور پر یہ ملحوظ رکھنا ہے (خبردار کرنا ہے) کہ دفعہ ۴۲ ایس آر ایکٹ ایسے افراد کے خلاف عائد کی جاسکتی ہے جو کہ کسی دوسرے کے حق کا انکار کرے۔ چنانچہ ان لوگوں (سنیوں) کے خلاف بھی قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے جو کہ موجودہ کیس

میں مدعیان کے حقوق کے خلاف رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ (بحوالہ اے۔ آئی۔ آر 1930 لاہور صفحہ 803۔ مدراس 769/1920 اور 46 آئی۔ سی 553) میرے نزدیک بڑا واضح لائحہ عمل ہے۔ جو اس کیس میں سنیوں کے برخلاف اختیار کیا جا سکتا ہے۔

تنازعہ نمبر ۵ فریق ثانی نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عدالت اس کی مجاز ہے کہ وہ مطلوبہ ڈیکلیریشن اپنی صوابدید پر جاری کرے اور مدعیان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس ڈیکلیریشن کو اپنے مطلق حق کے طور پر سند بنا لیں۔ اور یہ کہ اس طرح کے اجازت نامہ دینے سے بدنظمی، بدامنی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ دونوں مذہبی گروہوں میں کشیدگی کی صورت ہے۔ لہٰذا عدالت کو حالات کے پیش نظر ایسی اجازت دینے سے انکار کر دینا چاہیئے۔

حکم فیصلہ مدعیان کے حق میں!

جب انتظامیہ فریقین کے قانونی حقوق سے عدم واقفیت کے باعث اس قسم کا کوئی حکم جاری کرتی ہے جو کسی دوسرے عوامی طبقہ کے حقوق پر چھاپہ مارتا ہے تو اس عمل سے مستحق طبقہ میں بے چینی کی لہر اٹھتی ہے۔ اور اس سے مزید بدامنی پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے جابرانہ احکامات اس وقت جاری کئے جاتے ہیں جب قانونی حقوق کا تحفظ درکار ہو

اور امن عامہ کی صورت مخدوش ہو اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جب کبھی
بھی اس قسم کے متشددانہ احکامات صادر کئے گئے تو اسی ضرورت
کے تحت۔ قانون کے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرنے سے جو کہ اس مضمون
کے متعلق ہے اس معاملہ میں میری رائے یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ
کا زیر دفعہ ۱۴۴ جاری کردہ حکم قانونی حق سے ان کی غیر یقینی
صورتحال کے پیش نظر تھا جو ان کو قانون شناسی کے
بارے میں تھی (یعنی عدم واقفیت کے باعث) جسے صرف
ایک انسداد کسی بیماری سے احتیاطی تدبیر یا پرہیز کے مترادف
کہا جا سکتا ہے یعنی حفظ ماتقدم ہے میرے نزدیک ایسے مقدمات
میں جبکہ دو طبقوں میں باہمی جھگڑا ہو یا دو فریقوں کی نزاع ہو یا
سرکاری حکام اعلیٰ عدالتی حکام سے رجوع کر رہے ہوں کہ
قانونی تحفظ کیا ہو تو یہ معلوم ہو گا کہ کسی قانونی حق کی حفاظت
لازمی دستیاب سرکاری قوت کے ساتھ کی جائے۔ یہ چیز
بعض اوقات مشکل ہو جاتی ہے مگر طبقات کے لئے یہ لابدی
ہو جاتا ہے وہ اپنے حقوق کا تصفیہ کریں اور باامن رہیں اس
طرح جس طرح کہ پانی ہو کہ جب اسے قدرتی طرز پر بہنے دیا جائے
تو وہ اپنی سطح خود ہی متعین کر کے اس کی جگہ میں بہتا ہے
المختصر میں اب اس معاملہ کو کچھ مشاہداتی دلائل پر ختم کرتا ہوں
جو ہائی کورٹ کے ججوں نے اس موضوع کے بارے میں اپنے
فیصلوں میں ثبت کئے اور ان کو پریوی کونسل نے منظور کیا۔ ان کا
لب لباب یہ ہے کہ انتظامیہ، پولیس اور مجسٹریسی اپنے اختیارات

کو زیر دفعہ ۱۴۴ ض ف ۳۳ اور پولیس ایکٹ ۵ دفعہ ۳۰ سنہ ۱۸۶۱ء
یہی وہ قوانین ہیں جن کے تحت یہ ادارے مداخلت کرنے کے
مجاز ہوتے ہیں (A.L.J. 627 تا 624، 1931 - J. Benett)

کیا ان اختیارات کا استعمال ہر وقت ہونا چاہیئے؟

کیا ان کو مستحقین کے حق میں اور ان کے تحفظ کی خاطر اور ان کے برخلاف جو ان حقوق میں مزاحمت کرتے ہیں بروئے استعمال نہیں لانا چاہیئے؟ مگر ہنگامی صورت حال کے پیش نظر قانونی حقوق کے تحفظ اور بحالی امن و امان کے لئے ان کا استعمال برمحل ہے کیونکہ ایسی سنگین صورت میں وہ عام شہری حقوق معطل کر سکتے ہیں لیکن عارضی طور پر مدراس ہائی کورٹ کے ججوں نے دفعہ ۱۴۴ کے ضمن میں لکھا کہ بحالی امن و امان کے لئے مجسٹریٹ کے پاس خصوصی اختیارات ہوتے ہیں جو خاص موقعوں کے لئے محدود طور پر ان کو حاصل ہوتے ہیں۔ مجسٹریٹ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہر شخص کے حق کی حفاظت کا التزام کرے۔ جو قانون کے مطابق ہو۔

اور حفاظتی تدابیر اختیار کرے۔ اس لئے کہ دوسروں کے حق محفوظ رہیں۔ لیکن اگر مجسٹریٹ دیکھتا ہے کہ حالات ایسے ہیں کہ جن میں قانونی طرز عمل اختیار کرنے سے شہری ہنگامہ آرائی کا خدشہ ہے یا اضطراب و بے چینی کا خطرہ محسوس ہو رہا ہو تو عوامی سلامتی کے پیش نظر اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ عارضی طور پر پرائیویٹ حقوق کو نظر انداز کر دے اور

اپنے خصوصی مجوزہ اختیارات استعمال میں لائے اور یہ اقدام صرف ہنگامی حالات میں مناسب ہوگا۔

اس ہائی کورٹ نے ایک اور کیس 6/2003 میں اس طرح لکھا ہے کہ: جہاں حقوق کو خطرہ لاحق ہو تو مجازافسروں کو ان اختیارات کے ذریعے مکمل تحفظ حاصل کرنا چاہیے جو کہ ان کو قانون کی رو سے حاصل ہوتے ہیں جنہیں وہ نزاکت حالات کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ جواز کو ثابت کیا جائے کیونکہ وہ حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ طریقہ اختیار کرنا انتظامیہ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ایسے احکامات جاری کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان حالات میں جب کہ لاقانونیت کا رجحان ہوتا ہے اور انتظامیہ اس قابل نہیں ہوتی کہ قانون کا تحفظ کر سکے تو اس صورت مجبوری میں یہ اختیار خاص بھی تقاضائے انصاف بن جاتا ہے کیونکہ پبلک کے امن کو بحال کرنے کے لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ کسی کے شہری حقوق کو اس خصوصی اختیار سے دبا کر ختم کر دیا جائے۔ بلکہ درحقیقت یہ اقدام بھی تحفظ حقوق کی ایک تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے۔ نیز ایسا تاثر بھی ابھرتا ہے کہ اگر کوئی خیال کرے کہ قانون کے محافظ ادارے کمزور ہو گئے ہیں تو ایسے کے خلاف جو اس غلط فہمی میں قانون شکنی کرتا ہے اس کی بھول کا ازالہ کرنے کے لئے متعلقہ ارباب اپنے خصوصی اختیارات

کا استعمال کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو در اصل شہری حقوق کی پاسداری کرنے کا موثر نہ طاقتور طریقہ ہوتا ہے جہاں اس قسم کا تاثر اکثریتی آبادی کے ذہنوں میں سما جائے تو بحالت مجبوری ایسے جابرانہ احکامات اور متشددانہ طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں تاکہ خطرات و خدشات کا موثر مقابلہ کر کے قانون کا نفاذ کیا جا سکے۔ اور ایسے افراد جن کے لئے اوامر حکومت کی تعمیل تلخ ہوتی ہے۔ ہر جماعت میں موجود ہوتے ہیں لیکن پھر بھی جو لوگ عام طور پر قانون کو برقرار رکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں ان کو ورغلا لیا جاتا ہے۔

پریوی کونسل نے اس بات کو درست مانا ہے اور میرے خیال میں اس سے عمدہ الفاظ یا زبان اس کی وضاحت کے لئے اور کوئی نہیں ہے۔ جو مجسٹریٹ کے فرائض منصبی اور پولیس کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوں۔

مدعیان بلاشبہ یقینی طور پر یہ حق رکھتے ہیں کہ مطلوبہ اجازت نامہ ان کو جاری کیا جائے۔ لیکن ممکن ہے کہ اس قانونی حق کے ادا کرنے پر حالات میں گڑبڑ پیدا ہو چنانچہ مجسٹریٹ یا پولیس جس مقام پر یہ ضروری خیال کریں تو پابندی عائد کر سکتے ہیں مذکورہ بالا اختیار کی روشنی میں جس کا مقصد صرف امن کو بحال کرنا اور شاہراہوں کو مسدود ہو جانے سے روکنا ہوگا اور یہ سرکار کا حق ہے۔ جس کی تشریح اوپر بیان کر دی ہے۔ میں اپنے حکم فیصلہ میں اس کا اضافہ کرتا ہوں اور فرمان

جاری کرتا ہوں۔ "مدعیان کے حق میں" اس طرح جس طرح کہ معزز جج صاحبان سلیمان اور رینگ نے کیس 354/193 ALJ کے فیصلہ میں کیا ہے۔

حکم!

مدعیان اپنی انفرادی حیثیت سے اور جماعتی طور سے دونوں طرح یعنی پوری شیعہ آبادی جونپور کو یہ پورا پورا حق حاصل ہے کہ اپنا استدعا کردہ جلوس طبل و تاشہ نوحہ و ماتم کے ساتھ امام حسینؑ کی شہادت کی یاد میں مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی کرتے ہوئے اور سات افراد و قاتلین حسینؑ پر لعنت بھیجتے ہوئے جونپور کی ہر گلی، ہر بازار، ہر سڑک اور ہر شاہراہ سے نیز خصوصاً قاضی کی گلی میں سے گزر سکتے ہیں۔ یہ ڈیکلریشن بحق مدعیان کے حق کی تصدیق و توثیق کرتا ہے۔ اس بات سے مشروط ہے کہ اگر انتظامیہ کوئی ہدایت نامہ یا حکم نامہ امن وامان کی صورت حال کے پیش نظر مجسٹریٹ یا پولیس رکاوٹ یا خلل کے باعث یا ان مجوزہ امور کے باعث جو کہ دفعہ ۱۴۴ میں مرقوم ہیں یا دیگر قانونی مدات کے تحت یا ٹریفک کے قوانین کے تحت۔!

مدعیان اس مقدمہ کے اخراجات مدعا علیہان سے وصول کرینگے۔

دستخط
ٹھاکر پرشاد
منصف جونپور

20-7-1938

ضمیمہ :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

شیعہ مسلمانوں کا پیدائشی حق!

استفادہ از کے۔ ایم ندیم (ایڈووکیٹ)

مسلمانوں کی کامیاب مشترکہ تحریک ختم نبوت کے نتیجے میں قادیانیوں کے اسلامی برادری سے اخراج کے بعد بعض بدخواہ طبقے اور وطن دشمن عناصر آپس میں ملی بھگت کر کے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی یکجہتی، وطنی وقار اور ملکی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں۔ وجود مملکت کے لئے ہر خطرناک سازش کی راہ کو ہموار کرنا ان کا معمولی شغل بن چکا ہے۔ طرح طرح کی عصبیت کو ہوا دینا ان کا خاص مشغلہ ہے، کبھی لسانی تعصب، کبھی صوبائی عصبیت اور کبھی فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا ان کے خاص ہتھکنڈے ہیں۔ ان بدنیت لوگوں کی چشم بد کا خاص نشانہ ملک میں آباد شیعہ مسلم برادری اور ان کے مذہبی شعائر ہیں۔ چنانچہ وہ آئے دن شیعہ دشمنی کا غوغا برپا کر کے اتحاد قوم کو مجروح کرتے رہتے ہیں

یہ بات تو کسی بھی پاکستانی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ تقسیم ہند سے قبل کانگریس کے ہمنوا ملاّ ٹولے نے تقسیم ہند کی شدید مخالفت کرتے ہوئے تحریک پاکستان کی بھرپور مذمت کی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے نام نہاد مولویوں اور ان کے مٹھی بھر حامیوں نے بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح رحمت اللہ علیہ کو "کافراعظم" اور وطن مقدس پاکستان کو "کافرستان" کے ناموں سے متہم کیا تھا۔ مگر اللہ تبارک تعالیٰ نے ان کے منہ میں خاک ڈالی۔ قائداعظم بفضل خدا کامیاب ہوئے اور پاکستان معرض وجود میں آگیا۔ جب سرزمین پاک پر ہلالی پرچم لہرایا تو شقی القلب دشمن کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا مخالفین کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مارے شرم کے وہ زمین دوز ہو گئے اور خفیہ ریشہ دوانیوں میں لگ گئے۔ بھلا یہ کس طرح اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر سکتے تھے۔ ہمیشہ اس موقعہ کی تلاش میں رہتے کہ کب اور کس طرح پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کیا جائے بدقسمتی سے کچھ عرصہ بعد ان کے گلشن امید پر موسم بہار آہی گیا۔ مسلمانوں کی تاریخ کا بدترین المیہ ۱۹۷۱ء میں رونما ہوا۔ پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہو گیا۔ دشمن کا دل باغ باغ ہوا حوصلے بلند ہو گئے۔ مذموم عزائم میں نئی امنگیں ابھریں اور باقی ماندہ پاکستان پر نگاہیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ یہ حصہ اب ان کی آنکھ کا شہتیر ہے۔ چنانچہ دام و دانہ پھینکنے کا اہتمام ہونے لگا۔ مہلک جال کے ساتھ خود غرضی و تنگ نظری، صوبائی و لسانی

تعصب نسلی و جغرافیائی امتیاز، فرقہ وارانہ نفرت و عزہ کے دانے جگہ جگہ پھیلائے جانے لگے۔ ملی اخوت اور اسلامی بھائی چارہ کے نیک جذبات کو ٹھیس لگانے میں ہر ہتھیار آزمایا جانے لگا۔ باہمی نفرت کو ہوا دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا بھائی کو بھائی سے نبرد آزما رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ملکی امن و امان کو برباد کر دیا گیا۔ لاقانونیت اور بربریت کے بھوت دندنانے لگے بغض و عناد کی چنگاریوں کو بھڑکانے کے وسائل بروئے عمل لائے گئے۔ حتیٰ کہ ملک ایسی پر آشوب حالت میں مبتلا ہو گیا کہ ہر سو خطروں کے بادل چھائے ہوئے نظر آنے لگے۔ چاروں طرف ایسی آگ روشن ہونے لگی جو کسی بھی وقت سب کچھ فنا کر سکتی ہے۔ عام آدمی سہما ہوا ، غیر یقینی صورت حال سے دوچار عالم پریشانی میں گرفتار ہوا کے رخ کی جانب نظر جمائے مگم سم کھڑا ہے۔

دوسرا لشانہ

ہمیں وہ وقت یاد ہے جب مرزائیوں کے خلاف شیعہ سنی مشترکہ کوششوں کی کامیابی کے موقع پر مولوی غلام غوث ہزاروی نے فرقہ وارانہ تعصب سے بھرپور ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ غیر ذمہ دارانہ بیان داغ دیا کہ ان کی پارٹی نے ایک محاذ پر کامیابی حاصل کر لی ہے اور اب دوسرا نشانہ شیعہ ہیں۔ ہزاروی صاحب نے کہا تھا کہ انھوں نے احترام رسول کا اہتمام تو کر لیا ہے اور اب وہ ناموس صحابہ کی تحریک چلائیں گے۔ مولوی غلام غوث ہزاروی

کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا اشارہ اس ثانوی مہم میں براہ راست شیعہ مسلمان فرقے کی جانب تھا اور یہ ویسا ہی پرانا حیلہ تھا جیسا کچھ سال پہلے لکھنؤ میں شیعہ کے خلاف "مدح صحابہ" کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی تھی جو بعد میں برصغیر کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی تھی چنانچہ اس بے جواز مہم کے مضر اندیشوں کو اس وقت کی حکومت نے بر وقت محسوس کر لیا۔ لہٰذا قومی اسمبلی میں سابق وزیر خارجہ عزیز احمد مرحوم نے ایوان پر واضح کیا کہ حزب اختلاف ایسی تھیلی میں جو بلی چھپائے ہوئے ہے اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے کیونکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ختم نبوت کی تحریک تمام مسلمانوں کی متفقہ مشترکہ تحریک تھی اور خود حکومت بھی عظمت رسولؐ اور ناموس پیغمبرؐ کو بحال رکھنے کی دلی متمنی تھی۔ چنانچہ اس نے پاکستانی عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فریضہ ادا کیا جس کا سہرا اب حزب اختلاف شر پسندانہ انداز سے اپنے سر باندھ لینے کے لئے بے قرار رہی ہے۔ مگر یاد رہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ احترام صحابہ کے عقیدے کی طرح نہیں تھا کیونکہ حضور اکرم کو آخری نبی تسلیم کرنا ہر مکتب فکر کے مسلمان کا بنیادی اعتقاد ہے جبکہ صحابہ کا احترام ایک اخلاقی فریضہ ہے جس کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے۔

علاوہ ازیں شیعہ فرقہ پر یہ الزام کہ وہ پیغمبرؐ کے اصحاب کو نہیں مانتے حقیقت کے برعکس اور سراسر شر انگیز پروپیگنڈا ہے کیونکہ شیعہ اصحاب رسولؐ کی عظمت کے قائل اور ان کے

مخلص عقیدت مند ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سلمان فارسیؓ جیسے صحابی کو اہل بیت ہیں سے مانتے ہیں اسی طرح دیگر اصحاب عظام جیسے حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت مقدادؓ، حضرت عمار یاسر حذیفہ یمانیؓ، بلال حبشیؓ وغیرہم شیعہ کی محبت و عقیدت کے مرکز ہیں۔ (راقم نے کتاب "بجا کہ یا رہ" میں اسی موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہدیۂ قارئین کی ہے۔ اور اس الزام کی سختی سے تردید کی ہے کہ شیعہ اصحاب رسولؐ کو نہیں مانتے ہیں) اگر بعض ظاہر اسباب کے باعث یہ فرض کیا جائے کہ شیعہ اصحاب رسولؐ کے احترام میں کوئی کسر کرتے ہیں تو پھر سُنّی مذہب کے وہابی فرقے کے خلاف کونسی تحریک چلائی جائے گی جو پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجنے کے مخالف ہیں۔ سُنیوں کا یہ وہابی طبقہ فاتحہ، نذر و نیاز، درود و سلام یا محمدؐ سلام علیک یا نعرہ رسالت یا رسول اللہ، یا نعرہ حیدری یا علیؑ کہنے کو شرک قرار دیتا ہے۔

جماعت اہل السنۃ کی ایک یادداشت!

بہر کیف ان ہی ایام میں مذکورہ بالا شر انگیز مہم کے علاوہ مرکزی جماعت اہل السنۃ کے لاہور دفتر کی جانب سے ایک یادداشت شائع کی گئی جس میں پاکستان میں آباد سُنّی مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی مطالبات پیش کیے گئے۔ ان مطالبات پر اس وقت کی قومی اسمبلی کے سات ارکان کے دستخط موجود

تھے جن میں مولوی غلام غوث ہزاروی، مفتی محمود، شاہ احمد نورانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس یادداشت کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ چونکہ ملک میں سُنّی آبادی معین طور پر کثیر ہے لہٰذا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ شیعوں کے مذہبی جلوسوں اور مجالس عزا پر پابندی عائد کر دی جائے۔ سڑکوں عام گزرگاہوں اور شارع عام جگہوں سے شیعوں کے جلوس کا گزرنا ممنوع قرار دیا جائے۔ حکومت نئے پرمٹوں کا اجراء بند کرے۔ اور نئے امام باڑے نہ بنانے دیئے جائیں۔ شیعوں کی رسومات (عزاداری) کو اُن کے امام باڑوں تک محدود کر دیا جائے۔

مطالبہ ۳ کا آئینی تجزیہ

ان حالات اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جماعت کثیر کے اس مطالبے کا آئینی اور قانونی لحاظ سے جائزہ لیا جائے اور تجزیہ کیا جائے کہ آئین میں فراہم کردہ مذہبی آزادی سے یہ مطالبہ کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ایسی صورت میں شیعہ مسلمانوں کا اس پہلو پر غور و خوض کرنا ایک فطری تقاضا ہے۔

آئین میں دی گئی مذہبی آزادی!

پاکستان ایک جمہوری ریاست ہے اس کا اپنا آئین بھی ہے۔ اس دستور العمل میں مہیا کیے گئے حقوق و مراعات سے مستفیض ہوتا ہر پاکستانی

کا آئینی حق ہے۔ اس کے مطابق شہری زندگی بسر کرنا پاکستان کے تمام باشندوں کا یکساں فریضہ ہے۔ اس معاملہ میں مذہب، رنگ، نسل، فرقہ، اور حیثیت کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ آئین کے شق ۲ کے مطابق اسلام پاکستان کا سرکاری دین ہے۔ شق نمبر ۳۱ کی رو سے ایسے اقدامات ہونے چاہئیں کہ پاکستان میں آباد مسلم قوم انفرادی و اجتماعی لحاظ سے اپنی زندگیاں اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں و ضابطوں کے مطابق گزاریں۔ ایسی سہولیات و مراعات کا اہتمام کیا جائے کہ عام فرد قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزارنے کے مفہوم سے آشنا ہو سکے۔

اسی طرح آئین کی دفعہ ۲۰ (الف) اور (ب) ہر شخص کو مذہبی آزادی دینے کی ضمانت دیتی ہیں۔ نیز شق ۸ (۱) کے مطابق ایسے قوانین، رسم و رواج جو باب اوّل سے بغیر موافقت رکھیں کالعدم قرار دے دیئے جائیں گے۔

مذہبی ذرائع ابلاغ

مندرجہ بالا اقتباسات پر غور کرنے کے دوران یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ساری دنیا میں آباد مسلم برادری نیز پاکستانی مسلمان مختلف مذہبی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر مکتب فکر اپنے مسلک کے مطابق قرآن و سنت کی تعبیرات و تشریحات رکھتا ہے۔ بنیادی اصولوں کی تشریح توضیح تاویل جدا جدا کی جاتی ہیں۔ اہل السنت عموماً چار فقہی

مکاتب میں بٹے ہوئے ہیں حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی شیعہ فقہ جعفری کے پیروکار ہیں۔ کچھ غیر مقلد ہیں۔ پھر مقلدین میں بھی مختلف شاخیں ہیں۔ کوئی بریلوی ہے کوئی دیوبندی علیٰ ھٰذا القیاس جس نے جو طریقہ اختیار کر لیا ہے اسی کے مطابق اپنی مذہبی زندگی گزار رہا ہے۔ اور اس تفرقِ امت کا کسی طرح بھی علاج نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں قوالیاں، محافل میلاد، عرس و میلے، قرآن خوانی، نعت گوئی، مرثیہ و نوحہ خوانی مجالس عزا، مجالس قل، محفل سماع، سیرت کانفرنسیں، جلوس میلاد اور تعزیہ داری وغیرہ ایسے رسومات ہیں جو ان کے قدیم بزرگوں نے رائج کئے اور متاخرین عرصہ دراز سے ان کو اپنے مذہبی شعار سمجھ کر بجا لا رہے ہیں۔ ان مراسم کی بدولت وہ آپس میں رابطے رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ وہ قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ متقدمین نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے ان مراسم کو ذرائع ابلاغ کے طور پر رائج کیا ہے اور زمانے کی ترقی، تہذیب کے ارتقاء اور ثقافتی تغیر و تبدل نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے

عزاداری اور مقام حسینؑ بن علیؑ شیعہ فرقے کے نزدیک

عزاداری ایک ذریعہ ابلاغ ہے۔ اظہار تعزیت ہے مجالس و جلوس ماتم

ایسے مربوط وسیلے ہیں کہ جن کے ذریعے سے شیعہ مسلمان ایک مقام پر مجتمع ہو کر ایسی تعلیمات حاصل کرتے ہیں جو اُن کے نظریے کے مطابق قرآن و حدیث سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ مراسم عزاداری اختراعی نہیں ہیں بلکہ اُن کے مذہب میں تیرہ سو سال سے رائج ہیں اور اب وہ عملی اعتبار سے شیعہ کا ایسا جزو لاینفک بن چکی ہیں کہ شیعہ کی پہچان و علامت قرار پا چکی ہیں۔

اس مقام پر مسلمانوں کے ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا کہ بعد از وصال پیغمبرؐ کتنی جلدی یہ اُمت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ مطالعہ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ عزاداری کی رسومات، جلوس ماتم و مجالس عزا تقریباً ساری دنیا میں مروّج ہیں۔ اور اپنے اپنے طریقے سے ہر قوم یہ رسومات بجا لاتی ہے۔ مسلمانوں میں بھی اس کا رواج عام ہے۔ مگر شیعہ کی اختیار کردہ عزاداری سیّد الشہداؑ خصوصی امتیاز رکھتی ہے۔ اس کا مقصد بڑا پاکیزہ اور مقدس ہے۔ یہ ایک غیر فانی یادگار سے متصل ہے۔ ایسی مقدس و عظیم قربانی کی یادگار ہے جو نواسۂ رسولؐ سیّد الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام نے دینِ اسلام کے تحفظ کی خاطر بارگاہ الٰہی میں پیش کی۔ راہ خدا و رسولؐ میں تن، من، دھن سب کچھ لٹا دیا۔ چنانچہ حسینؑ مظلوم اور ان کے شہید انصار و اعوان کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے ان خاصان خدا بندوں کے سنہرے کارناموں کو سلام محبت کہنے کی خاطر

شیعہ مسلمان عزاداری برپا کرتے ہیں۔ شہادت کبریٰ کی
یہ یاد صرف شیعہ مسلمان ہی نہیں مناتے بلکہ شیعہ سُنّی مشترکہ
طور پر اس عظیم سانحہ پر اظہار تعزیت کرتے ہیں۔ چنانچہ
بانی جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی
ایک تقریر بعنوان "شہادت امام حسینؑ" میں فرمایا کہ ہر سال
محرم کے مہینے میں کروڑوں مسلمان کیا سُنّی یا شیعہ سب
شہادت امام حسینؑ پر اظہار تعزیت کرتے ہیں۔ پس
امام حسین علیہ السلام کی ذات عالی صفات تمام مسلمانوں
کے لئے بلا لحاظ فرقہ و مسلک مشترکہ و متفقہ طور پر لائق تعظیم
ہے۔ وہ سب مسلمانوں کے امام اور بزرگ ہیں۔ جیسا کہ مولانا
کوثر نیازی نے اپنی کتاب "ذکر حسینؑ" میں تحریر کیا ہے کہ
امن کمیٹیاں وہاں بنائی جاتی ہیں جہاں امن کو خطرہ ہو
امن کو خطرہ وہاں رہتا ہے جہاں کوئی متنازعہ مسئلہ موجود
ہو اور میں سوچ رہا ہوں کہ محرم کے اس مقدس مہینے میں
مسلمانوں کے درمیان ایسا کون سا متنازعہ مسئلہ ہے جو امن
کے لئے خطرہ بن سکے۔ کون مسلمان ہے، حسینؑ جس کے ایمان
کا حصّہ نہ ہو۔ کون کلمہ گو ہے جس کی رگوں میں عشق حسینؑ خون
کی طرح نہیں دوڑتا۔ کون سی آنکھ ہے جو امام کی پیاس کے
تصور میں بھیگ کر فرات نہیں بنتی۔ کون سا دل ہے جو حسینؑ
کی محبت کو سمیٹنے کے لئے صحراؤں کی طرح پھیل جانے کا خواہشمند
نہیں ہے لیکن اگر کوئی تنازعہ ہو سکتا ہے تو ان کی ذات سے عشق

کا تنازعہ ہے۔ اور یہ عشق وہ ہے کہ ہر مسلمان اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا تمنائی ہے۔ حسین پر اگر کوئی تنازعہ ممکن ہے تو اس جذبۂ قربانی پر ممکن ہے جبکی وہ زندہ مثال ہمارے سامنے پیش فرما گئے۔ ہر مسلمان دوسرے سے بڑھ کر اس قربانی کی تقلید کرنا چاہے گا۔

چنانچہ ایسی صورت میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے غیر متنازعہ بزرگ، سبط رسولؐ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ پر عزاداری سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے۔ پس مسلمانوں کے لئے یہ ایک قدر مشترک ہے چاہے وہ پاکستان میں آباد ہوں یا دنیا کے کسی اور خطے میں۔ البتہ فروعی اعتبار سے اس کے طریقوں میں معمولی اختلافات کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن اصولی طور پر اتفاق ہے۔ لہٰذا عقلاً یہ ممکن نہیں کہ عزاداری امام حسینؑ سے کسی مسلمان کو دکھ یا تکلیف پہنچے۔ یا حسینؑ کے نانا کی امت کے کسی فرد کو ایسے متفقہ امر پر کوئی اعتراض یا شکایت ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اگر ایسا ممکن بھی ہو تو پھر بھی پاکستان کے آئین میں دی گئی مذہبی شعائر کی بجا آوری کی آزادی جو آئین کی شق ۲۰ (الف) کے مطابق پاکستان کے ہر شہری کو مساوی طور پر حاصل ہے۔ ایسے اعتراض و شکایات کو غیر آئینی قرار دیتی ہے۔ شق ۲۵ جو نہ صرف آئین کا لب لباب ہے بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی روح ہے۔ پاکستان میں آباد ہر شہری کو اس کے

اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کا تحفظ اور ضمانت بخشتی ہے۔ چنانچہ آئین کے مطابق حاصل شدہ حقوق شیعوں کے لئے نہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ وہ دوسرے مسلمان فرقوں کے تابع فرمان ہیں۔ بلکہ از روئے دستور ہر شخص مذہبی لحاظ سے آزاد ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ مذہبی طریقے کے مطابق زندگی گزارے۔ چنانچہ اس امر کی وضاحت ہم ملک کی ایک اعلٰے عدالت کے صادر کردہ فیصلے کے اقتباس کو نقل کر کے پیش خدمت کرتے ہیں۔

سابق مغربی پاکستان ہائی کورٹ لاہور کی رٹ پٹیشن نمبر 392 سنہ 1961ء کے حوالہ سے مرقوم ہے کہ:

"ہم اس وجہ سے نا آشنا ہیں کہ جس کے باعث درخواست گزار کو سنہ 1961ء سے تعزیہ نکالنے کا اجازت نامہ سنہ 1957ء تک جاری نہیں کیا گیا ہے جب کہ محرم کا مہینہ سر پر آن پہنچا ہے۔ ہم نے بنظر عمیق جائزہ لیا ہے کہ ہر فرقے کے پیروکار مسلمان کو اپنی مذہبی تقریبات و رسومات کی آزادانہ بجا آوری کا حق حاصل ہے۔ قانونی اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ ہر شہری یہ حق رکھتا ہے کہ اپنے مذہبی رواجوں کو اپنے طریقوں سے منائے۔ اس حق سے محض اس لئے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چند افراد اس پر اعتراض وارد کرتے ہیں۔ پولیس کا فرض منصبی ہے کہ وہ قانون کا نفاذ کرے اور بدامنی کا سدباب کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کمی و بیشی نہیں۔"

اسی طرح ضلع ملتان کی ایک عدالت نے اسی نوعیت کے معاملہ میں لکھا ہے کہ " مجھے یہ واضح کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ممتاز آباد کالونی کے شیعوں کا یہ موروثی اور بنیادی حق ہے کہ عزاداری کے جلوسوں کو برآمد کریں۔ زمین پر موجود کوئی طاقت بھی ان کو ان کے اس حق سے نہیں روک سکتی جس سے وہ مستفید ہوتے رہیں بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ کے "۔

الغرض ایسی واضح آزادی اور قانونی تحفظ کے باوجود معلوم نہیں ماتمی جلوس کے لئے نئے اجازت ناموں کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے؟ آئینی لحاظ اور قانونی اعتبار سے تو یہ مطالبہ کوئی بنیاد نہیں رکھتا لہٰذا انتظامیہ یا دیگر متعلقہ افراد کا نئے پرمٹ کا مطالبہ کرنا از روئے قانون شہری حقوق میں بے جا مداخلت اور نا روا دست اندازی کے مترادف ہے۔

اس سلسلہ میں چند معروضات مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) :۔ بنیادی یا فطری حقوق جو کسی فرد کی ذات سے متعلق ہوں ان کو حاصل کرنا اور استعمال کرنا باشندہ طبقوں کے ہر مرد، عورت حتیٰ کہ نو مولود کا بھی حق ہوتا ہے۔

ب :۔ بنیادی و فطری حقوق کو غصب نہیں کیا جا سکتا خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کو استعمال نہیں کیا جا رہا ہے ایسے حقوق سے دست کش یا دست بردار کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ پبلک پالیسی کی بنیاد پر قائم کوئی حق چھینا نہیں جا سکتا پاکستان

کے شہری ان آئینی حقوق سے باہر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ نہ ہی یہ حقوق ان سے چھینے جا سکتے ہیں نہ ان میں تخفیف و تلخیص ہو سکتی ہے۔

ج:۔ عزاداری پر کسی بھی قسم کی عارضی یا بندی عائد کرنے کا عمل معنوی لحاظ سے اور عملی اعتبار سے شیعہ کی قدرتی افزائش کے لئے ایک رکاوٹ ہے۔ نئے اجازت ناموں کا مطالبہ اور اجراء مسلمان شیعہ فرقے کے مذہبی حقوق پر آری چلانا ہے۔ اور دستور پاکستان کی دفعہ ۲۰ الف کی دھجیاں اُڑانا ہے جس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے کہ پاکستان کا ہر شہری اپنے اختیار کردہ مذہبی فرقہ کے مطابق عمل کرنے میں بااختیار ہے۔

د:۔ پاکستان ترقی پذیر ملک ہے۔ اس کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ بحالیات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شہری اور مضافاتی آبادیاں بن رہی ہیں۔ نئی نئی رہائشی اسکیمیں اور تعمیراتی منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں۔ نئے تھانے اور نئے دفتر قائم ہو رہے ہیں۔ افزائش کی ایسی صورت میں نئے لائسنسوں کی مرحمت پر پابندی بلاشبہ غیر فطری اور لاقانونی ہے۔ یہ عمل قانونی و دستوری لحاظ سے متضاد ہے۔

چنانچہ نئے لائسنس کے بارے میں سنہ ۱۹۳۱ء میں الہ آباد کے ہائی کورٹ نے ایک مذہبی جلوس نکالنے کے پرمٹ کے حصول کا معاملہ نمٹایا اور عدالت نے تحریر کیا کہ:۔

"یہ ہر طبقے و فرقے کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے طریقے سے اپنا مذہبی جلوس شاہراہ عام سے گزارے۔ یہ موروثی حق کسی رسم و رواج یا اس کی قدامت کا محتاج نہیں ہے۔ چاہے وہ نئی بات (جدّت / بدعت) ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بھی قانونی حق میں شمار ہوگی۔ کیونکہ حق اس بارے میں بے نیاز ہے کہ وہ رسم کے پرانا ہونے یا نیا ہونے کے پہلو کو مدِنظر رکھے۔ وہ اس کی عدمیت یا تعطل یا فرسودہ پن سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ہے۔"

اوپر بیان کردہ قانونی توضیحات اور آئینی تشریحات کے علاوہ ملک کی کتاب قانون میں ایسے قوانین موجود ہیں جو کسی کو یا ہر کسی کو سزا کا مستوجب ٹھہراتے ہیں اُسے جو الفاظ سے، تقریر سے تحریر سے، علانیہ، خفیہ یا اشارۃً کسی کے جذبات کو ابھارے مذہبی، نسلی، علاقائی، لسانی، رہائشی، ذاتی، فرقہ جاتی یا کسی اور عصبیت سے جس سے کہ لوگوں کے مختلف گروہوں میں باہمی تلخی، منافرت، ناگواری اور دشمنی پیدا ہو۔ مختلف مذہبوں، نسلوں، زبانوں، علاقوں، قوموں اور طبقوں میں اشتعال جنم لے۔ اس جرم کی پاداش میں پانچ سال کی قید اور جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ (پاکستان پینل کوڈ A-153-S)

اس کے علاوہ ایک اور قانون کے تحت ملک دشمن کارروائی کے سدّباب میں مجسٹریٹ کو یہ اختیار تفویض کیا گیا ہے کہ وہ پوری مستعدی کے ساتھ ایسے عناصر کے خلاف تادیبی اقدام کریں جو ان کے ضلعی حدود میں فرقہ وارانہ انتشار پھیلانے کا ارتکاب کرتے ہیں۔

قانون میں دستیاب یہ آئینی ضمانتیں بلا مقصد نہیں ہیں
بلکہ امن و امان، نفاذ قانون اور حفاظت حقوق کے لئے ہیں۔
چنانچہ پاکستان کا ہر شہری اقلیت و اکثریت کے امتیاز سے
بالاتر رہ کر اپنے مذہب پر پوری آزادی کے ساتھ مکمل پیرا رہ
سکتا ہے۔ آئین کے سایہ میں ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل
ہے۔ آئین نہ اقلیت سے شرماتا ہے نہ اکثریت پر نازاں ہے
لہذا نفاذ قانون کے مرحلے میں تعداد افراد کا لحاظ نہیں رکھا
جا سکتا کہ اگر اکثریت قانون شکنی کرے تو بوجہ کثرت آبادی
ان کو قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں آئینی تحفظات
کی موجودگی کے باوجود شہری ابھی سماجی زندگی کو مذہبی منافرت
اور فرقہ واریت کے شر سے محفوظ نہیں پاتے۔ ملک کے اکثریتی
طبقے نے یہ غلط تاثر قائم کر رکھا ہے وہ کثرت نفری کے بل بوتے
پر جو چاہیں من مانی کر سکتے ہیں۔ اقلیتی مسلم گروپ کے ساتھ
تحکمانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں اور ان کے بنیادی حقوق کو ادا
کرنا یا نہ کرنا ان کے جمہوری اختیار میں ہے اسی طرح ملکی سول انتظامیہ
کا برتاؤ بھی اسی طرح کا ہے جو مذکورہ غلط وہم کی عکاسی کرتا ہے
کہ وہ اکثریت و اقلیت کے پہلو کو قانونی تقاضوں پر فوقیت
دیتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ شیعوں کے مذہبی مراسم
صدیوں پرانے ہیں اور سینکڑوں برس سے مسلسل منائے
جاتے رہے ہیں۔ ان شعائر مذہبی کو شیعہ کی مدنی زندگی کا حصہ

تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی ہے اور اس سچی بات کو ماننے سے اجتناب برتا جاتا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی تازہ مزاحمت پیدا کر دی جاتی ہے۔ جس سے شیعوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس بات کی جانب متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ انتظامیہ کو کسی شہری کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے کا خفیف سا اختیار بھی نہیں ہے۔ دنیا کی تمام جمہوری ریاستوں کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ شہری زندگی کے مذہبی پہلوؤں سے مقامی انتظامیہ کلیتہً لاتعلق رہتی ہے۔ اور اس کو شہریوں کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے ماسوا ایسے سنگین حالات کے جب نقص امن کا اندیشہ ہو یا کسی کی حفاظت مطلوب ہو یا ملکی سلامتی کے لئے کوئی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ اسی اصول کو دستورِ پاکستان میں بڑے اہتمام کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔

یہ بدقسمتی اور تکلیف دہ امر ہے کہ مقامی سول انتظامیہ کو آئین کے بارے میں مناسب و معقول تربیت نہیں دی جاتی ہے، نہ ہی ان حکام کے دلوں میں آئین میں تحفظات حقوق شہریت کی محبت و قدر کو راسخ کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کم فہمی کے باعث یہ غلط تاثر ان کے ذہنوں پر منقش ہو جاتا ہے کہ تھوڑی آبادی والے فرقے کے لوگ اپنی مذہبی آزادی کا پیدائشی حق اس شرط پر حاصل کر سکتے ہیں کہ زیادہ آبادی والے فرقے کے لوگ اس پر رضامند ہوں جبکہ

یہ خیال سراسر بے بنیاد ہے۔ چنانچہ انتظامیہ کے مداخلتی پہلو کو ہم بحوالہ PLD 1966 فیصلہ رپورٹ لاہور صفحہ ۶ سے نقل کرتے ہیں۔

"عدالتیں دیوانی اور فوجداری اس لئے قائم کی گئی ہیں کہ وہ لوگوں کے حقوق کا تحفظ کریں۔ چنانچہ مجسٹریٹ کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت حاصل شدہ اختیارات اس لئے تفویض ہوئے ہیں کہ وہ مبینہ حقوق کے دفاع کی خاطر ان کو عارضی طور پر استعمال کر سکیں۔"

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ بات یقینی اور حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شیعہ کی عزاداری پاکستان کے دستور العمل میں مصدقہ طور پر محفوظ ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی رو سے انہیں پوری پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔

چنانچہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہر حق کے متوازی ایک فرض ہوتا ہے رسومات عزاداری، مجالس و جلوس کو خالصتاً مذہبی ہونا چاہیئے اور ان کے تقدس و احترام پر کسی طرح بھی آنچ نہیں آنی چاہیئے۔ اس کو سیاسی پلیٹ فارم بنانا یا کسی بھی اور غیر مذہبی مقصد کے لئے وسیلہ ٹھہرانا سراسر مذموم اور غیر آئینی ہے۔

کتابت:- یوسف رضوی ۸-۹

عبدالکریم مشتاق